قیامِ پاکستان کے بعد پہلی عید کی کہانی پرویز صاحب کی زبانی

(ماخوذ از درسِ قرآن از پرویز، مورخہ 15 اگست 1980ء۔ تصویر اگلے صفحہ پر دیکھئے۔)

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

''عید تو میں نے کہا آزاد لوگوں کی ہوتی ہے، محکوموں کی عید کیا صاحب! ایک ہجوم ہے اکٹھا ہو گیا۔ وہاں جو آئے تو ذہن میں آیا کہ اب جو عیدِ آزاداں ہے، اس کی پہلی عید ہمیں میسر ہو گی، وہ ساری خوشیاں ہمارے ذہن میں تھیں اور ہمیں پہلی عید جو آئی اپنی آزاد مملکت میں تو وہ اس کیفیت سے عید آئی تھی۔ عجب کیفیت ہے، میں اس کیف اور سرور کو نہیں بھول سکتا جو وہاں عید کی دو رکعتوں میں مجھے سعادت نصیب ہوئی۔ قائداعظمؒ (محمد علی جناح) اگلی صف میں تھے، ان کے بعینہٖ ٹھیک پچھلی صف میں، بالکل ان کے پیچھے، میں کھڑا تھا۔ ایک عظیم شخصیت جس نے ہندو جیسی قوم کی غلامی کی زنجیروں سے چھڑا کر ہمیں آزادی دی تھی۔ وہ مردِ مومن جنہیں میں دس سال سے قریب سے جانتا تھا، دل بھی مومن، دماغ بھی مومن بڑی بلند شخصیت اور ان کے پیچھے یہ سعادت کہ دو رکعتیں نماز کی ادا کی گئیں۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے ''جاوید نامہ'' میں کہا ہے، عجیب چیز ہے۔ وہاں تو دو رکعتیں وہ جلال الدین افغانی اور سید حلیم پاشا کے ذکر میں آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است

اس قسم کے انسانوں کے ساتھ اگر کہیں دو رکعت نماز کی مل جائے، اطاعت اس کو کہتے ہیں۔

ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

''ورنہ اودیہاڑی ہوندی ہیگی اے، جیہدی جنت ملدی ہوندی ہیگی آ'' کیا بات ہے اقبالؒ کی!

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

میں نے کہا ہے کہ اس کے لئے دیہاڑی کا ہی لفظ صحیح آتا ہے، ورنہ یہ وہ کام ہے جس کی مزدوری جنت مل جاتی ہے۔ اطاعت تو اس قسم کے مردوں کے ساتھ دو رکعتیں ادا کرنا ہیں۔ عزیزانِ من! وہ دو رکعتیں جو میں نے ادا کی ہیں، اس مردِ مومن کے پیچھے کھڑے ہو کر، میں ساری عمر ان کا کیف و سرور نہیں بھول سکتا۔ لیکن اس عید کے بعد جب وہ کھڑے ہوئے اور ہجوم کر کے لوگ ملنے کے لئے جا رہے تھے، ان کی آنکھوں کا جو نم تھا وہ مجھ سے ہزار داستانیں کہہ رہا تھا۔ عید کی خوشی میں مل رہے تھے لوگوں سے، جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور، عزیزانِ من! وہ پہلی عید جس طرح سے غم آلود گزری، 33 سال ہو گئے، 33 عیدیں آئیں، ایک عید بھی تو خوشی کی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ طرح ایسی پڑ گئی اس پہلی عید کی ہمارے ہاں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا۔ ''عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں'' ایک شاعر کا مصرع ہے، وہ اس لئے کہ اس نے سچ کہا تھا اس نے عیدِ آزاداں کہا تھا۔ آزادی محض مملکت کے نقشے کے اوپر لکیر کھینچنے سے تو حاصل نہیں ہو جاتی۔ آزادی اور چیز ہوتی ہے۔ ملک کا آزاد ہو جانا اور چیز ہوتا ہے، انسانوں کا آزاد ہونا اور چیز ہوتا ہے۔ وہ نہیں نصیب ہو سکی۔ اس کے باوجود آپ جانتے ہیں کہ میں تو ان میں سے ہوں جو کہا کرتا ہوں کہ

مِلّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، اُمیدِ بہار رکھ!

(اقبال: بانگِ درا)

فہرست

لمعات:

شہادت فاروق و حسین (رضی اللہ عنھما)	ادارہ	3
اقبال کا مردِ مومن	پرویزؒ	8
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں اسے	انجینئر عبید الحمید فاروقی	33
قانون کی اہمیت	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	43
بنگلہ دیش کی کہانی دو صحافیوں کی زبانی	ادارہ	48
ہم مسلمان کیوں ہیں؟	عارف محمود کسانہ	54

ENGLISH SECTION

HAPPY NEW HIJRA YEAR 1432
By Abdus Sattar Ghazali 1

طلوعِ اسلام کا لٹریچر یہاں سے دستیاب ہے

نیچے درج کئے گئے کتب خانوں سے طلوع اسلام ٹرسٹ کی تمام کتب، دروس القرآن کی تمام جلدیں، اسلامی کتابیں اور لائبریری کے لئے تمام موضوعات پر ہمہ قسم کتب رعایتی نرخوں پر خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔

1- کلاسک بک سیلرز، 42، دی مال (ریگل چوک)، لاہور۔ فون: 042-37312977، موبائل: 0300-4442226

2- علمی کتاب گھر، اردو بازار، کراچی۔

3- البلال بک سنٹر، اردو بازار، کراچی۔

4- مذہبی کتب خانہ، اردو بازار، کراچی۔

5- مکتبہ دارالسلام، اردو بازار، کراچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دانائے راز

(غلام احمد پرویز کے مختصر حالاتِ حیات)

علامہ اقبالؒ نے دمِ واپسیں فرمایا تھا:

سرُودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

علامہ غلام احمد پرویزؔ (رحمتہ اللہ علیہ) کی ولادت مورخہ 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آپ کے دادا' مولوی' چوہدری' رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہر طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ علامہ غلام احمد پرویزؔ کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیرِ نگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہو چکی تھیں۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے اور 1954ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تا کہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران میں آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ 1932ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمۂ ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ:

> ''عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔''

علامہ پرویزؒ کی بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ نظریہ' اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہو سکتی ہے قرآن کی نہیں۔ اس لئے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) (سید سلیمان ندوی کی زیرِ ادارت) کی

جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت تابہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جرأتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

1926ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہو گیا ہے لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

علامہ اقبالؒ کے خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلہ ''معارف القرآن'' کی ابتدا 1928ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا۔ ''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی۔ جس میں آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ۔ جن۔ شیطان۔ وحی۔ رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے نور''۔ چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلۂ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ۔ ''انسان نے کیا سوچا''۔ کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ عقلِ انسانی۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے۔ آپؒ نے ایک کتاب بعنوان۔ ''اسلام کیا ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں معاشی نظریات کی بنیاد پر دنیا دو بڑے بلاکوں میں منقسم تھی۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لئے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظام ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہانِ فردا!'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں کے تصورات کس طرح

رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ جناب پرویزؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطۂ عوامی کے ایک آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآنِ مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا' یا ہو رہا ہو' ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کون سی ہے جس کے زیرِ انتظام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر مشتمل تھی' جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی' نہ جماعت' نہ کوئی مالی ذریعے تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیرلبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابلِ فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد' رابطۂ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی' تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کر لے' سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے (اس نے اسے بتا دیا تھا)۔'' (طلوع اسلام' دسمبر 1978ء صفحہ 49)۔

سلسلۂ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی

ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور ''مطالب الفرقان'' کے نام سے تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام خطوط'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اسلامی معاشرت اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین۔ بعنوان ''قرآنی قوانین'' اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔۔ (Islam a Challenge to Religion) اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لئے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو فخریہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوع اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیاکریسی رائج کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قراردادِ مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماء سنت کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لئے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پرزور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف فتویٰ کفر دے دیا جس پر ایک ہزار ''علماء'' کے دستخط ثبت تھے۔

ضخیم تصانیف کی لمبی فہرست۔ ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزارہا صفحات۔ ہفتہ وار درس اور تقاریر کے ٹیپس (Tapes) کا ڈھیر جواب سی ڈی/ڈی وی ڈی کی شکل میں دستیاب ہیں نیز تسوید کے بعد طباعت بھی ہو چکی ہے۔ تحریکِ پاکستان میں باوجود سرکاری ملازم ہونے کے سرگرم شمولیت، قائداعظمؒ سے قرب حاصل ہونے کے باوجود مراعات حاصل کرنے سے انکار، اپنے خلاف کفر کے فتوؤں سے بے پروا ہو کر اپنے مشن میں مگن۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ کھنگال ڈالئے۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا شخص جس نے تنِ تنہا اتنا زیادہ اور اتنا ٹھوس کام کیا ہو؟

5 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ اور 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍO وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِO (55:26-27)-

کیونکہ ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

☆☆☆☆☆☆☆☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰسین	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	325/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	325/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-				
سورۃ الانبیآء	(21)	336	225/-				
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	264	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				
سورۃ الشعرآء	(26)	454	325/-				
سورۃ النمل	(27)	280	225/-				
سورہ القصص	(28)	334	250/-				
سورہ عنکبوت	(29)	388	275/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

فکرِ پرویز۔۔ایک مختصر ترین تاثر

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے' یہ کوئی تیس بتیس سال پرانی بات ہے' یعنی یہی کوئی آٹھ دس برس کی عمر میں ہماری سماعت سے یہ فقرہ ٹکرایا تھا' ''لو جی! مسلمانوں میں پرویزیوں کے نام سے ایک نیا فرقہ ایجاد ہو گیا ہے۔'' یہ الفاظ ہمارے ایک پیر پرست مہربان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ صاحب پاکپتن میں ہمارے میزبان تھے۔ یہ تھا ''فکرِ پرویز'' سے ہمارا پہلا تعارف۔ عہدِ طفولیت میں بھلا ہمیں اس ''فرقے'' سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی' تاہم تجسس کا پہلا بیج اسی دن بویا گیا۔ کئی سال گزر گئے' لیکن نہ جانے کیوں متذکرہ نیم طنزیہ تعارفی جملہ ہمیں بھولا نہیں' تا آنکہ ہمیں دسویں جماعت میں ایک بزرگ استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ رحیم بھٹہ صاحب اس ہستی کا اسم گرامی ہے۔ جواب کافی معمر ہو چکے ہیں۔ ''جماعت احمدیہ'' کے برگزیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں رحیم صاحب کے بے حد احترام کے باوجود ان کے مذہبی اعتقادات سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے متعلق اور کیا کہیں بس غالبؔ کا یہ شعر عرض کر سکتے ہیں ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اس عاجز پر رحیم صاحب کے لاتعداد احسانات میں سے سرفہرست یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ''فکرِ پرویز'' سے باقاعدہ متعارف کروایا۔ ان کی وساطت سے ہی غلام احمد پرویز کی تصنیف ''قتلِ مرتد'' ہمیں ملی۔ میٹرک کا سٹوڈنٹ ایک علمی کتاب سے جتنا استفادہ کر سکتا ہے' ہم نے بھی کیا۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ کم و بیش ربع صدی گزر جانے کے باوصف نہ صرف اس کتاب کے مندرجات ہمیں اچھی طرح یاد ہیں بلکہ اس حوالے سے پرویز صاحب کے مثبت نقطہ نظر نے مستقل ہمارے قلب و ذہن میں جگہ بنا لی۔ بعد میں ایسی کئی تقریریں اور تحریریں ہماری سماعتوں اور بصارتوں سے ٹکرائیں جن میں ارتداد کو جرم ثابت کرنے کے لئے بعض روایتی سوچ رکھنے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا' لیکن سچی بات ہے ان کی ایک بات بھی دل کو نہ لگی۔ اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق پرویز صاحب نے جو صراحت کی' وہ اتنی معقول ہے کہ اس کا ہر جواب پوچ ہے۔ بعض علمی مجالس میں ہم نے ''رسک'' لے کر اس باب میں بعض ثقہ علماء کرام سے براہ راست استفسارات کر کے بھی دیکھ لیا' لیکن جواباً ہمیں قابل رحم عجز کا مشاہدہ ہی کرنا پڑا اور ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ محض ایک شخص کی معاندت اور غیر مستند تاریخ و روایات کی صنم پرستی نے انہیں کیسے دن دکھا دیئے ہیں کہ کائنات کی پاکیزہ ترین شخصیت ﷺ کا تقدس بھی انہیں عزیز نہیں رہا کہ بلا جھجک زبان پر ایسی ناروا باتیں لے آتے ہیں کہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے ایک عام اور گنہگار مسلمان کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں راستی کا راستہ

دکھائے۔

قصہ مختصر علم وادب سے وابستگی جیسے جیسے پختگی کے مراحل طے کرتی گئی غلام احمد پرویز مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ جاری رہا۔ اگرچہ اس دوران میں کئی پڑاؤ آئے طویل وقفے بھی آئے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

1983-85ء کا عرصہ بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے ایف سی کالج میں گزرا۔ ہوسٹل میں مقیم رہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ 25/B گلبرگ 2۔ پرویز صاحب کی رہائش ہے۔ یہ بھی خبر تھی کہ آپ ہر ہفتے درس قرآن دیتے ہیں۔ ''ثواب طاعت وزہد'' جاننے کے علی الرغم جانے کیوں طبیعت ادھر نہیں آئی۔ تعلق خاطر جانے کس کس نوع کے دار ورسن کی اور لئے پھرا بس ادھر رخ نہ ہوسکا ''ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا''۔ حقیقت یہ ہے سب سے بڑی نعمت' نعمت کی موجودگی کا احساس ہے اور ہمیں بھی اس نعمت کا احساس اس دن ہوا جب یہ نعمت روئے ارض پر موجود نہ رہی۔ ایک دم قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''چندراوتی'' کا پہلا فقرہ یاد آیا ہے:

''جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا.....''۔

صاحبو! ہم وہ تاریخی دن کیسے بھول سکتے ہیں' جی ہاں 25 فروری 1985ء ہم اپنے کزن سے ملنے ایف۔سی کالج سے ریواز گارڈن گئے۔ واضح رہے ان دنوں ہمارے پاس ایگل کی بائیسکل ہوا کرتی تھی اور پورا لاہور اس کے دو پہیوں کی گردش میں سمٹنے پر مجبور بلکہ ''مجبورِ محض'' تھا۔ وہیں ریواز گارڈن میں اخبار کے پہلے صفحے پر ہماری نظر پڑی' پرویز صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر نے بے کل کر دیا۔ ان کی موت سے زیادہ افسوس ہمیں یہ لاحق ہوگیا کہ اتنا قریب ہونے کے باوجود ان سے مل نہیں سکے' انہیں سن نہیں سکے' ان کی زیارت نہیں کر سکے۔ اسی تاسف نے جسم و جاں میں ایک عجیب سی توانائی بھر دی' اپنی سائیکل اٹھائی' ریواز گارڈن سے سیدھے 25/B گلبرگ پہنچے۔ سفر آخرت کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ پرویز صاحب ایک چارپائی پر پڑے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان سے محبت کرنے والے ان گنت احباب اردگرد موجود تھے' کہیں آنسو رواں ہیں' کہیں دبی دبی سسکیاں تو کہیں قدرے بلند آواز میں گریہ۔ پرویز صاحب کے بھائی (مرحوم) ڈاکٹر عارف بٹالوی سب کو تسلیاں بھی دیتے جاتے تھے اور خود روتے بھی جا رہے تھے۔ ہم نے بار بار جی بھر کے اس عظیم انسان کو دیکھا جس نے ایک عہد کو متاثر کیا تھا۔ برآمدے میں ایک عمر رسیدہ شخص اونچی آواز میں اپنے محسن پرویز صاحب کو یاد کر رہا تھا۔ اس کا نام مرزا سلطان بیگ (نظام دین) تھا۔ جنازہ روانہ ہوا۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل رہے۔ منی مارکیٹ کی گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ تدفین کا مرحلہ آیا تو بھی ہم موجود رہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ان کے کسی عزیز نے دور سے (غالباً کراچی سے) پہنچنا تھا' چنانچہ تدفین کے مرحلے کو کچھ مؤخر کر دیا گیا کہ فلائٹ کا انتظار کیا جانے لگا۔ اس دوران میں کہ ان کی آخری آرامگاہ تیار ہو چکی تھی' پاس چارپائی پر ان کی میت پڑی تھی۔ قریب ہی جناب حنیف رامے نے اپنی چادر بچھا دی۔ ہم لوگ ان کے کہنے پر وہاں بیٹھ گئے۔ ان دنوں رامے صاحب کا ایک مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا' بے حد متنازع ہونے کی وجہ سے ہر حلقے میں موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ اس خاکسار نے اس مضمون کی بابت رامے صاحب سے جو دو ایک سوالات پوچھے تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ بڑی گرما گرم باتیں ہوئیں۔ واپس آ کر اس گفتگو کے تضمنات پر مبنی اور پرویز صاحب کے آخری سفر کی روداد' جو دس بارہ صفحات پر مشتمل تھی' ہم نے رحیم صاحب کو خط کی صورت میں بھیجی تھی'

کیا عجب ان کے پاس یہ مفصل خط محفوظ ہو۔

بہرنوع وقت کا دریا اپنے غیر متعین تعینات کے ساتھ بہتا رہا۔ ہم ''طلوع اسلام'' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آدھ کنونشن میں شریک ہونے کی سعادت بھی ملی۔ کبھی کبھار پرویز صاحب کی کسی کتاب میں سے بھی گزرنے کا موقع ملتا رہا۔ ''فکر پرویز'' سے تعلق رکھنے والے دوستوں' اسلم صابر صاحب' محمود الحسن صاحب' ڈاکٹر اسلم نوید صاحب اور دیگر منسلکین سے رابطے رہے' مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا' ذہنی افق پھیلتا رہا۔ لیکن حق یہ ہے کہ پرویز کو پڑھنے اور سمجھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا تھا۔ اب سے کوئی تین سال قبل کی بات ہے کہ یہ عاجز بسلسلہ ملازمت ساہیوال میں مقیم تھا۔ وضاحت کر دیں کہ ہمارا تعلق شعبہ تدریس سے ہے۔ کوئی 15/16 سال ہو گئے ہیں' مختلف کالجوں میں پڑھاتے ہوئے۔ 2001ء میں جب ڈسٹرکٹ گورنمنٹس کا ڈول ڈالا گیا تو ہماری رضا معلوم کیئے بغیر ''جبراً'' ہمیں کلاس روم سے اٹھا کر آفس میں بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے عامیوں کی نگاہ میں ''ڈائریکٹر کالجز'' ہونا عزت کی بات ہو پر ہمیں تو یہ سراسر قید بامشقت کے مشابہ عمل محسوس ہوا۔ لہٰذا دو اڑھائی سال مسلسل سفارشیں ڈھونڈتے رہے کہ کوئی ''رجل غیب'' ہمیں اس جھنجٹ سے نجات دلا دے' ہم باز آئے اس ''ایجوکیشن افسری'' سے۔ سیدھی سی بات ہے ہم تو انہیں لفظ و حرف ہی ماننے کو تیار نہیں جو لٹریچر (علم و ادب) سے واسطہ نہ رکھتے ہوں اور یہاں تو اعداد تھے' ہندسے تھے' لایعنی میٹنگز تھیں' انکوائریاں تھیں' ٹیکنیکل انسپیکشنز تھیں' فزیبلٹی رپورٹس تھیں' Expenditure State Ments تھیں' آڈٹ تھے' جی حضوری کی ایک زنجیر تھی۔ دستور یہی تھا کہ اوپر والوں کی ہر نامعقول بات ہنسی خوشی سہو اور نیچے والوں پر خوب خوب رعب گانٹھو۔ کیا عرض کریں اس افسری لائن میں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں' چنانچہ اب بھی یہ گنگناتے رہتے ہیں' ''جنہیں ہم بھولنا چاہیں وہ 'افسر' یاد آتے ہیں۔''

خیر وہ جسے Good out of Evil کہتے ہیں۔ اس کی رو سے مذکورہ اذیت بلکہ ''شر'' میں سے ہمیں بھی خیر کے کچھ پہلو ضرور ملے۔ میر دردؔ نے کیا عمدہ شعر کہا ہے ؎

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر
سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

یہ درست کہ لمحۂ موجود میں ہم آزاد ہیں' اس ''سمناک'' ماحول سے ہمیں چھٹکارا مل چکا ہے لیکن یہ بہت بڑا سچ ہے کہ اگر اس Misery کا ہمیں ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوا ہوتا' زندگی کی سفاک جہتوں کے ہم خود شاہد نہ ہوتے تو ممکن ہے پرویز صاحب کی تصانیف میں موجود ''زندگی کے زہر'' کو نوشِ جاں کرنے کی صلاحیت سے عاری رہتے۔ وہی بات ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی' نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صاحبو! آپ ذرا سوچئے وہ فرد جس نے چالیس برس مذہبی گھرانے' مذہبی معاشرے میں بتائے ہوں کیا وہ مذہب کے بغیر لقمہ بھی توڑ سکتا ہے؟ نہیں جناب یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اس فرد کے طرزِ احساس کی بُنت میں مذہب کا Fibre بنیادی تانے بانے کے طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر اتفاق سے کوئی ایسا واقعہ اس فرد کے ساتھ پیش آ جائے کہ اسے ''بدنصیبی'' سے اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو خالص معروضیات کی دھوپ میں کھینچنا پڑ جائے' غیر جانبدار ہو کر ان کا جائزہ لینا پڑ جائے' ہر خوش عقیدگی کو منہا کر کے ان کا تجزیہ کرنا پڑ جائے تو عین ممکن ہے نتائج کی بے رحم صورت دیکھ کر اس فرد کو ہارٹ اٹیک آ جائے اور وہ سچائی کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے ہی کوچ کر جائے۔

دوستو! یہ خاکسار عربی' فارسی' انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم پرویز کو اپنا محسن کیوں نہ قرار دے کہ ہمیں موت کی وادی سے بچانے والا یہ واحد بندہ ہے۔ بات جسمانی موت کی نہیں' مسئلہ ذہنی موت کا ہے۔ ہمیں پرویز نے ذہنی موت سے بچایا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت سے قبل جسمانی طور پر مر جائے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت کے بعد جسمانی سطح پر زندہ رہے۔ کوئی اس عذاب کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

دفتری زندگی کے دوران ایک مرتبہ نہیں ان گنت مرتبہ ایسا ہوا کہ زندگی بغیر کسی آراستگی کے' بغیر کسی ورق کے' ہر Drapery سے مکمل بے نیاز سامنے آتی رہی۔ ایسے لمحے بار بار آئے کہ غیبی قوتوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی' لیکن یہ کیا کہ Stretch the Truth والا فارمولا بلکہ مجرب نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا' پر ہوا کچھ نہیں' جو زمینی حقائق تھے' وہ جوں کے توں رہے' جو سچ تھا' وہ وہی رہا۔ اسباب کا جادو ہی سر چڑھ کے بولا' علت اور معلول کے بیچ رشتے کی توانائی اس شدت سے ابھر کر سامنے آئی کہ I was Stumped.

طاقچے کے خطوط پڑھتے پڑھاتے عمر بیت گئی تھی' کچھ پلے نہیں پڑا تھا' یہ پرویز ہی تھا جس نے اقبال کے یہ شعر یوں سمجھائے کہ ہمیں ''کلیات اقبال'' میں انہیں اس نیت سے تلاش کرنا پڑا' کہیں یہ اشعار پرویز نے خود گھڑ کر تو اقبال سے منسوب نہیں کر دیئے' آپ بھی سنئے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جی ہاں صاحبو! یہ پرویز صاحب کی ''کتاب التقدیر'' تھی جس کے بالاستعیاب مطالعہ نے وہ گرہ کھول دی جو ذہن میں بیس برس سے پڑی ہوئی تھی' کس کس نکتہ ور کی بارگاہ میں ناصیہ فرسائی نہیں کی تھی ہر کہیں سے ایک سا ہی جواب موصول ہوا تھا۔ ''نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی''۔ اس معرکہ آرا کتاب کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے تو اپنے اللہ سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی کہ یارب الارباب! اس عاصی کو معاف کر دے کہ اب تک اپنا ہر جرم تیرے کھاتے میں ڈالتا آیا ہوں۔ تیرے قادر ہونے کا مفہوم اصفیاء وعلماء نے مجھے یہی سمجھایا تھا کہ گناہ کی توفیق بھی تو دیتا ہے' نیکی کی سعادت بھی تو ہی بخشتا ہے۔ گمراہ بھی تو کرتا ہے' ہدایت کے جادے پر بھی تو ہی گامزن کرتا ہے۔ بندہ مجبور ہے' تیرے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے' مختاری کی تہمت سے مہتم.....لیکن یہ پرویز تھا جس نے قرآن کھول کر دکھایا کہ نہیں نہیں یہ پاک خدا پر الزام ہے' اس نے تو ہر انسان کو مکمل اختیار دیا ہوا ہے اور پھر اس نے وہ آیات ایک ایک کر کے سمجھائیں جن میں تضاد محسوس ہوتا تھا' جو خدا کو غیر عادل ثابت کرتی تھیں' بے انصاف بتاتی تھیں۔ بندے کو مجبور صورت میں پیش کرتی تھیں۔ جب سارے عقدے کھل گئے تو زبان اپنے آپ یہ تلاوت کرنے لگی: ؎

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں تھے

ضمناً پرویز صاحب نے ہی وضاحت کی' قرآن مجید کی کوئی آیت تو دور کی بات ہے' ایک نقطۂ شعشہ تک بھی منسوخ نہیں۔ ورنہ بڑے بڑے زہاد پانچ سات آیتوں کے سامنے دم بخود یہ اقرار کرتے پائے گئے: اے آیتو! تم پر تو عمل نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ یہ کریڈٹ اس پرویز کے کھاتے میں ہی لکھا جائے گا جسے سارے علماء صبح وشام کافر کافر کہتے نہیں تھکتے۔ آپ یقین

کیجئے مسئلہ تقدیر سمجھ میں آنے کے بعد اس عاجز کو وہی لذت محسوس ہوئی جو پوری تحقیق کے بعد کسی نومسلم کو قبول اسلام کی ملکوتی ساعت میں محسوس ہوتی ہوگی۔

غلام احمد پرویز کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ختم نبوت کا حقیقی مفہوم سمجھایا تفصیل پھر کبھی سہی' اجمالاً اتنا عرض ہے کہ احمدیوں کے ساتھ ہمارا بڑا وقت گزرا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو مجموعی طور پر اچھے کردار والے انسان پایا ہے' شرافت اور علم تقریباً ہر احمدی کے امتیازی اوصاف ہیں کہ ان کی جماعت منظم ہے' تربیتی نظام مثالی ہے لیکن ان لوگوں کے اعتقادات ریت کی دیوار ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کیوں معروضی بنیادوں پر اپنا جائزہ نہیں لیتے؟ ہم اپنے طور پر اس کی دو وجوہ تلاش کر سکے ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے علماء نے اس جماعت کے خلاف نفرت کی ایسی فضا تیار کی ہے کہ یہ لوگ اپنے کمزور عقیدوں کے ساتھ اور زیادہ مضبوطی سے جڑ گئے ہیں۔ اگر انہیں پیار کے ساتھ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو آج نتائج یکسر مختلف ہوتے۔ دوسری بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ختم نبوت کے باب میں عام مسلمانوں کا قریب قریب وہی موقف ہے جو خود قادیانیوں کا ہے۔ جی ہاں ایک آنے والے کا عقیدہ مسلمانوں کی میراث ہے۔ ''ہم نے احمدی علماء VS علمائے اسلام'' کافی مناظرے سنے ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ عام سے احمدی نے بھی اچھے بھلے عالم دین کو وہ عبارات دکھا کر لاجواب کر دیا جن میں غیر تشریعی نبوت کے اجرا کو ہمارے اکابرین نے تسلیم کیا ہے۔ اب یہ اکابرین عامی شامی نہیں' جید ہستیاں ہیں۔ اس نازک صورتحال میں علماء کرام اسی معروف تاویل کا سہارا لیتے ہیں کہ غیر تشریعی نبی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہے وہ چونکہ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں' آخری زمانے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے لئے تشریف لائیں گے۔ اس پر ذہین احمدی فوراً یوں گرفت کرتے ہیں۔ جناب! اصل چیز پھر ''ضرورت نبوت'' ہوئی۔ اگر تجدید و احیائے دین کے لئے پرانا نبی آ سکتا ہے تو نیا کیوں نہیں؟ اور پھر وہ نیا جو قرآن کو منسوخ کرنے والا نہ ہو' حضور ﷺ کا امتی ہو۔ نیز ختم نبوت کے پھر معانی یہی ہوئے کہ حضور ﷺ فضیلت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ نبی ہیں' آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی پیروی میں کوئی نبی مبعوث ہو جائے تو آپ ﷺ کی ختمیت مرتبی متاثر نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد نو کے بعد متاثر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اور مسلم شریف کی احادیث کے مطابق ان پر وحی بھی اترے گی۔

دوستو! یہ جری شخص غلام احمد پرویز تھا جس نے قرآن کی رو سے توضیح کی' ختم نبوت کا مطلب ہے' حضورؐ ہر لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' پرانا نہ نیا۔ قرآن بار بار شہادت دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام بھی اسی طرح وفات پا چکے ہیں جس طرح تمام انبیاء کرام رحلت فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اب کسی کی آمد کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ختم نبوت کا مطلب ''ضرورتِ نبوت'' کا خاتمہ ہے۔ اب ہدایت کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآن ہے' کوئی نئی وحی نہیں' حتیٰ کہ کسی مترادف نام و متبادل عنوان سے بھی اللہ کا کلام کسی بندے پر نازل نہیں ہوگا' کیونکہ اللہ کا کلام حجت ہوتا ہے' اب قرآن کے بعد جو اس حجت کو بیچ میں لائے گا' وہ امت کو نئی تقسیم سے دوچار کرے گا۔

ویسے جملہ معترضہ کے طور پر ذرا غور کیجئے کہ احمدیوں کا مسئلہ سلجھانا کتنا آسان تھا یہ لوگ وفات مسیحؑ کے پہلے ہی قائل ہیں۔ انہیں صرف خاتم النبیین کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت تھی۔ انہیں بتایا جاتا کہ آیات روایات پر مقدم ہیں۔ جب آیات یہ اصولی فیصلہ دے

رہی ہیں کہ نئی نبوت ممکن ہی نہیں تو آپ اس فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں' کسی اور طرف آپ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قول رسولؐ اور آیت ربانی میں تناقض ہو۔ جب اللہ کی کتاب کہہ رہی ہے حضورﷺ آخری نبی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں تو پھر حضورﷺ کا نقطہ نظر اس سے ہٹ کر کیسے ہوسکتا ہے؟ نتیجہ معلوم! دیکھنے والی چیز یہ ہے کہ ازسرِنو جائزہ لیا جائے وہ فرامین جو حضورﷺ سے منسوب کئے جا رہے ہیں کیا وہ حضورﷺ کے ارشادات ہیں بھی یا نہیں؟ پرویز صاحب نے ہی قوم کو سمجھایا کہ حدیث رسولؐ رہنمائی کا بلاشبہ سرچشمہ ہے لیکن یہ طے ہونا ازبس ناگزیر ہے کہ جسے حدیث رسولؐ کہا جا رہا ہے وہ حدیث رسولؐ ہے بھی یا نہیں؟ اور ساتھ ہی انہوں نے بہترین معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ جو قول قرآن کے مطابق ہے وہ قول رسولؐ ہے جو اس کے برعکس ہے وہ قول رسولؐ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تناظر میں پرویز کو منکر حدیث کہنا سراسر ناانصافی ہے یا نہیں؟

غلام احمد پرویز کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ بھی کئی جلدوں کی کتاب میں لیا جا سکتا ہے۔ وقت آئے گا ان پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں تحقیقی مقالے لکھوائیں گی' تب امت مسلمہ کو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا شخص ان میں ہو گزرا ہے۔ ایسا شخص جس نے مدت العمر قرآن اور صاحبِ قرآنﷺ سے ایسا عدیم النظیر عشق کیا کہ واقعتاً دور دور تک مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پچاس سے زائد تصانیف چھوڑ کر جانے والے پرویز نے کہیں نہیں کہا کہ میرا کہا حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے عمر بھر عجز وانکسار کی ردا اوڑھے رکھی اور یہی کہتے رہے کہ میں قرآن کا معمولی طالب علم ہوں' جس طرح مجھے سمجھ آئی' خلوصِ نیت سے اسی طرح آگے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ اتنا اہم علمی خزینہ تخلیق کرنے والے پرویز نے کسی فرقے کی بنا نہیں رکھی۔ ان کی جماعت وہی تھی جو رسول کریمﷺ کی جماعت تھی۔ ظاہر ہے اللہ کے نبی نے اپنی امت کو فرقوں میں بانٹنا تو درکنار دیکھنا بھی پسند نہیں کیا' اسی لئے پرویز صاحب نے بھی علامہ اقبال کی طرح بس ایک فکر دی ہے' اب اس نابغہ عصر کی فکر سے پوری کی پوری امت کتنا نور کشید کرتی ہے' یہ اس پر منحصر ہے۔ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک قرآن مجید کی شرح اپنی ضخیم تصانیف میں محفوظ کر دی ہے۔ جو ایک مربوط نظام فکر سے بجا طور پر معنون کی جا سکتی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ روشنی کے اس مینار سے استفادہ کرتے ہوئے اس قرآنی معاشرے کی تشکیل کریں جس میں مسرتیں ہوں' بدعنوانیاں نہ ہوں' محبتیں ہوں' خوشحالیاں ہوں' انسانی ذوات نشوونما پائیں' امن ہو' فساد نہ ہو' افلاس کا عذاب نہ ہو۔ سب اپنے سوہنے اللہ کے قوانین کی اطاعت کریں اور اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا ہی پیار کریں جتنا ان کی خوبصورت ذات سے ان کے دوستوں حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر مخلص احباب رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو تھا۔

بایزید یلدرم

صابر صدیقی صاحب کا نام طلوع اسلام کے حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ طلوع اسلام ٹرسٹ سے ان کی کتابیں ابلۂ مسجد' اور کن فیکون شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ''بایزید یلدرم'' ان کا ایک تاریخی ناول ہے جو انہوں نے بہت محنت سے لکھا ہے۔ یہ ناول ادارہ طلوع اسلام سے رعایتی قیمت -/150 روپے علاوہ ڈاک خرچ میں دستیاب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ڈاکٹر سید عبدالودود (مرحوم)

طلوعِ اِسلام نے کیا دیا؟

[یہ وہ حقیقت کشا اور حیات انگیز خطاب ہے جو 19 اپریل 1959ء کی شب کو ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ایم۔سی مرحوم و مغفور نے طلوع اسلام کنونشن میں دیا۔ خلوص میں ڈوبی ہوئی مردِ مجاہد کی یہ آواز ایوان کو فکر و نظر کی ان گہرائیوں میں لے گئی جہاں زندگی، اس کے مقاصد، اور جانکاہ فرائض بے نقاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ خود پرویز صاحب اس خطاب کے دوران میں تاثر میں ڈوبتے چلے گئے اور خطاب کے خاتمے پر نعرۂ تحسین بلند کرتے ہوئے اسٹیج پر آئے اور ڈاکٹر صاحب کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ملت قابل مبارک ہے کہ اس میں ایسے فکر خالص رکھنے والے مردِ مجاہد موجود ہیں اور یہ کہ وہ خود کو بالخصوص قابل مبارکباد سمجھتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ قرآنی فکر کے سمجھنے والوں میں ڈاکٹر موصوف جیسے مخلص اور مجاہد بھی شامل ہیں۔]

جن اصحاب کو طلوع اسلام کے ساتھ دلچسپی ہے میں ان سے اکثر سوال کرتا ہوں کہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں وہ کونسی چیز ہے جو آپ کو پسند ہے۔ مختلف لوگوں کے مختلف جواب ہوتے ہیں۔ بعض بہنیں یہ کہتی سنی گئی ہیں کہ ''طاہرہ کے نام خطوط'' میں جو عائلی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بے نظیر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''سلیم کے نام خطوط'' کا انداز بڑا دلکش ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''انسان نے کیا سوچا'' میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ اکثریت ان احباب کی ہے جو ''نظام ربوبیت'' کے دلدادہ ہیں۔ ایک صاحب نے جو طلوع اسلام کی اکثر مخالفت کرتے ہیں لیکن جب مجھ سے ملتے ہیں تو انداز گفتگو ذرا مختلف ہوتا ہے کہا کہ ہاں ''معراج انسانیت'' میں جو مستشرقین کی آراء رسول اللہ ﷺ کے متعلق اکٹھی کی گئی ہیں وہ بڑی دلچسپ اور قابل داد ہیں۔ ایک صاحب نے الٹا مجھ پر سوال کر دیا کہ تم خود بتاؤ کہ تمہیں طلوع اسلام کی کونسی ادا پسند ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے جس چیز نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ Attract کیا وہ اسلامی نظام کا نقشہ اور پھر نظامِ ربوبیت ہے لیکن میرے خیال میں یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ صرف ہماری اپنی اپنی میلان طبع کا اظہار ہے۔ بہتی ندی میں سے ہر ایک اپنی اپنی Capacity کے مطابق چلو بھر لیتا ہے ورنہ انسانی زندگی کا وہ کونسا پہلو ہے جس پر قرآن نے روشنی نہیں ڈالی اور قرآن کا وہ کونسا گوشہ ہے جسے طلوع اسلام نے بے نقاب نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ طلوع اسلام کا قوم پر جو سب سے بڑا احسان ہے وہ یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دی ہے۔ حضرات! آپ کو قائداعظم کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب تقسیم ملک سے پہلے وہ ایک مرتبہ نواب بھوپال سے ملنے گئے۔ واپسی پر نواب صاحب نے قائداعظم کے ہمراہ اپنے ایک سیکرٹری مسٹر سین کو بھیجا۔ راستہ میں اس شخص نے قائداعظم سے سوال کیا کہ جناب ملک کی فضا اس وقت خراب ہے ہر طرف افراتفری اور سیاسی بے چینی پائی جاتی

ہے۔آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟ قائداعظم نے کہا کہ مسٹر سین آپ خود ہی بتائیے کہ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے۔مسٹر سین نے کہا کہ جناب میرے خیال میں قوم کے اندر Clear Thinking نہیں رہا۔قائداعظم نے فوراً پلٹ کر جواب دیا کہ مسٹر سین میں اس وقت سیدھا بمبئی جا رہا ہوں۔اگر واپس نواب صاحب کے پاس جانا ہوتا تو ان سے کہتا کہ وہ آپ کو ایک بہت بڑی جاگیر بخش دیں۔حضرات! قوم کے اندر Clear Thinking کا پیدا ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج فضا بدل رہی ہے۔ بڑی تیزی سے نہ سہی بہرحال بدل رہی ہے۔آپ پریس اور پلیٹ فارم پر تحریروں اور تقریروں کے انداز سے سمجھ رہے ہیں کہ آج سے چار پانچ سال پیشتر کی فضا کیا تھی اور آج کیا ہے۔اس وقت ملک کا Intelligentsia اسلامی ریاست کے تصور سے کانپتا تھا۔ اخبارات میں کھلم کھلا 'اسلامی ریاست' کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے اور لوگوں کے مزاج میں بڑی تندی تھی۔مثال کے طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ 55ء میں جس وقت ہماری دوسری آئین ساز اسمبلی ایک اسلامی آئین بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی' لاہور کے ایک انگریزی ہفتہ وار نے جو کچھ لکھا تھا میں اس کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکیں گے کہ اس وقت اسلامی آئین کی مخالفت کی شدت کس قدر تھی۔اس اخبار نے لکھا کہ یہ اسلامی ریاست ہے کیا؟ اور اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ کیا یہ موجودہ جمہوری تقاضوں کو پورا کر سکے گی؟ پھر لکھا کہ یہ اسلامی ریاست کے تصور ہی کے طفیل ہے کہ عرصہ آٹھ سال سے ملک کا آئین تیار نہیں ہو سکا۔اس اسلامی ریاست کے تصور نے دنیا کے سامنے ہمیں اضحوکہ بنا کر رکھ دیا ہے اور باہر کی دنیا کو ہم کیسے جھٹلا سکتے ہیں جب وہ ہمیں Sentimental Fools یعنی جذباتی بے وقوف کہہ کر پکارتے ہیں اور ہمیں Religious Extremists یعنی مذہبی انتہا پسند کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہبی دیوانگی خوراک ہے۔کٹر پن وہاں کا قاعدہ ہے اور مذہب لوگوں کی افیون ہے۔

Fanaticism is the food, orthodoxy the rule and religion the dope.

پھر اس نے لکھا کہ ہم مذہبی بحثوں میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو کافر بنانے میں اس قدر مست ہیں کہ ہم دنیا کے دیگر مسائل سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔فلاں چیز اسلامی ہے اور فلاں غیر اسلامی۔فلاں مسلمان ہے اور فلاں کافر۔اس کے سوا دنیا میں ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں اور ہماری نظر مذہبی دیوانگی پر ایسی جمی ہوئی ہے کہ ہم کبھی اسلام کے پیروؤں کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور ہم اپنے باپ داداؤں کے کارناموں پر اس قدر مست ہیں کہ ہمیں مستقبل کی خبر نہیں۔اس نے پھر لکھا کہ ہمارا اسلامی سال بھی رونے پیٹنے سے شروع ہوتا ہے اور کوئی دھیان نہیں دیتا کہ اس رونے پیٹنے سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ اگر ہم نے رونا ہے تو کیوں نہ ہم ان پاکستانی مسلمانوں کے لئے روئیں جو مر مر کر زندہ رہ رہے ہیں۔جو روٹی کے ٹکڑوں اور چیتھڑوں کے لئے ترس رہے ہیں اور کیوں نہ ان کے لئے روئیں جو کام کرنا چاہتے ہیں لیکن کام نہیں ملتا اور ان بچوں کے لئے روئیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ زندہ باپ کے یتیم بچے ہیں اور اگر ہم نے ٹسوے بہانے ہیں تو کیوں نہ ان مریضوں کے لئے بہائیں جنہیں نہ دوا میسر ہے نہ خوراک اور کیوں نہ ان لولے لنگڑوں کے لئے بہائیں جو خستہ حالت میں سڑکوں پر پڑے ہیں۔پھر لکھا کہ مذہبی ریاست کا تصور ہمیں وہاں لے آیا ہے جہاں ہم انسانوں کی طرح رہنا بھول چکے ہیں۔یہ اسلامی ریاست کی

تلاش جنگی بطخ کے شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ پہلی آئین ساز اسمبلی کے بنیادی اصولوں کی سفارشات کے متعلق اس نے لکھا کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفوں کو یقین ہے کہ موجودہ جمہوری اصول پاکستان کے لوگوں کے موافق نہیں۔ یہ مسودہ پاکستان کی ذلت اور جمہوریت کی توہین ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ انسانی حقوق کی نفی ہے اور آزادی کے منہ پر ایک تھپڑ ہے۔ یہ دوبارہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی ایک مکارانہ چال ہے۔ یہ دوغلی دستاویز ہے جس میں ہر ایک اچھی چیز غائب ہے اور ہر بری چیز کی نقل ہے۔ لوگ ان دقیانوسی چیزوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چاہے انہیں اسلامی کہا جائے یا غیر اسلامی۔ ہم نے غیر ضروری طور پر اسلام کے گھوڑے کو اپنی سیاسی گاڑی کے آگے جوت رکھا ہے۔

حضرات! یہ تھے آج سے چار سال پہلے کے خیالات جو تعلیم یافتہ پاکستانی نوجوانوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طبقہ کی اسلام سے برگشتگی ملا ازم کے خلاف کتنا بڑا Reaction ہے۔ ملا کی پریشاں خیالی کا Reaction بھی کتنا پریشان کن ہے۔ یہ تھی وہ فضا جس کو درست کرنے میں طلوع سلام مسلسل کئی برسوں سے مصروف کار ہے۔ اسی اخبار میں جس کا میں ذکر کر چکا ہوں آرٹیکل شائع ہوتے رہے جو طلوع اسلام کے خیالات کی ترجمانی کرتے رہے اور دو اور دو چار کی طرح بتاتے رہے کہ اسلامی ریاست کے متعلق جو گھناؤنا تصور پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر غلط ہے جس چیز کو اسلام کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ دراصل اسلام سے کس قدر دور ہے۔ وہ ایک پردہ ہے جو اسلام اور مسلمان قوم کے درمیان حائل ہے۔ وہ اسلام کے جسم میں ایک بہتا ہوا ناسور ہے جو اسے نڈھال کر رہا ہے اور یہ کہ اسلام پوجا پاٹ کا معاملہ نہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ یہ ایک سوشل آرڈر ہے۔ یہ سوشل آرڈر کی بجائے مذہب میں تبدیل اس وقت ہوا جب اس کی مرکزیت جاتی رہی۔ جب رسول ﷺ کا Successor کوئی باقی نہ رہا۔ جب امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والا امت کا کوئی نمائندہ باقی نہ رہا جب Church and State دو جدا جدا Institutions بن گئے۔ یہ پھر سے سوشل آرڈر بن سکتا ہے۔ اگر مرکزیت لوٹ آئے۔ اگر رسول کے Succession کے سلسلہ کو پھر سے قائم کر دیا جائے۔ اگر پیشوائیت جو اپنی طبعی موت مر رہی ہے اسے دفن کرنے کا جلد انتظام کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی آئین بنانا کس قدر آسان ہو جاتا ہے اگر اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ Islamic Social Order درحقیقت Permanance اور Change کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ اگر اپنے موجودہ مسائل کی جزئیات کو قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر باہمی مشاورت سے طے کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی طرزِ زندگی اور غربت وافلاس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں غربت وافلاس بے کسی اور بے بسی ہے وہاں اسلام نہیں۔

حضرات! لاہور کے پبلک جلسوں میں آج سے چند سال پیشتر کھلم کھلا زمینداروں اور جاگیرداروں کی حمایت کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے قارونوں کی حمایت میں ہامان بڑی بے حیائی سے اپنا So-called اسلام پیش کرتے تھے اور مترفین اپنی انجمنوں کے نام بڑے دلکش، مثلاً شرعی زرعی اصلاحات وغیرہ وغیرہ رکھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مترفین کا گروہ اسلام کا پیدا کردہ ہے۔ اور صرف اسی ایک وجہ سے ہمارا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے متنفر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن جب پبلک جلسوں میں نظام ربوبیت پیش ہونے لگا تو باوجود اس کے کہ یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی لوگوں نے کھڑے ہو کر کان لگانا شروع کیا کہ یہ نئی چیز کیا ہے۔ آہستہ آہستہ عوام کی طرف

سے یہ مطالبات بھی ہونے شروع ہو گئے کہ وہ اس آواز کو بار بار سننے کے خواہشمند ہیں۔ اخبارات میں جب اِکے دُکے مضامین اس موضوع پر نکلنے شروع ہوئے تو لوگوں نے اس میں دلچسپی لی۔ گذشتہ دو ایک سالوں میں محترم پرویز صاحب کے دورے جو ملک کے اس حصے میں ہوئے ان کا بھی نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ آج ملک کے چوٹی کے اخبارات باوجود اس کے کہ یہ آواز ان کی پالیسی کے مطابق نہیں بادل ناخواستہ ہی سہی اس میں حصہ ضرور لیتے ہیں۔ آج ملک کا Intelligentsia کم از کم یہ کھڑا ہو کر سوچنے ضرور لگا ہے کہ یہ آواز کیا ہے۔ یا کم از کم ان کے جذبات میں اسلام کے خلاف وہ تندی موجود نہیں جو پہلے تھی۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہیں میں بڑی مدت سے جانتا ہوں وہ ایسے لوگ تھے جو اسلام کے نام سے بڑے بیزار تھے۔ لیکن اب وہ کم از کم اس مرحلہ سے نکل چکے ہیں جس میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلامی ریاست کا تصور جنگلی بطخ کے شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تھوڑی بہت تبدیلی اس لئے ہے کہ قوم کے سامنے ایک واضح چیز پیش کی جا رہی ہے جس میں نہ الجھاؤ ہے اور نہ پریشان خیالی۔ لیکن حضرات! میں آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا کہ طلوع اسلام کا مشن بڑا کامیاب ہو چکا ہے۔ اس حد تک تو کامیاب ہے کہ ایک خوشبو ہے جو پھول سے باہر آ چکی ہے لیکن اس مشن کو کامیاب بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے کام Single-handed نہیں ہو سکتے۔ ایک مفکر اپنی دھن میں لگا ہوتا ہے وہ افکار کی دنیا میں بستا ہے اور ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتا جاتا ہے۔ ان افکار میں اگر صلاحیت موجود ہو تو وہ اپنے اثرات خود بخود چھوڑ جاتے ہیں لیکن مفکر بذات خود اس سے بے نیاز ہوتا ہے کہ کون اس کی طرف توجہ دیتا ہے اور کون نہیں۔ جو لوگ ان افکار سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس مفکر کے ہم سفر بننے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ ان کا کام ہے کہ اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لیں۔ اور اس کے پیغام کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ان Ideals کو اپنانے کے بعد ان کا کام صرف یہی نہیں رہ جاتا کہ کتابیں پڑھتے رہیں۔ لیکچر سنتے رہیں اور خراج تحسین ادا کرتے رہیں۔ یہ بقول شخصے ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔ جو لوگ محترم پرویز صاحب کے رفیق کار بننے کے متمنی ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ اس مشعل کو جو انہوں نے ان کے ہاتھ میں دی ہے لے کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں اور' اگر' اور جب ممکن ہو سکے ملک کے باہر بھی اس روشنی کو پھیلائیں۔ حضرات! اگر ارادہ مضبوط ہو اور آنکھیں کھلی ہوں تو قدرتی طور پر ایسے مواقع ابھر ابھر کر سطح پر آتے رہتے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پریس' پلیٹ فارم و دیگر ممکن ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے لیکن افسوس کہ طلوع اسلام کی بزموں نے ابھی تک اس بات کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ آپ حضرات میں اکثریت ان احباب کی ہے جو اچھے پڑھے لکھے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اچھا لکھ سکتے ہیں۔ اچھا بول سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پریس میں اہمیت اس چیز کو حاصل ہوتی ہے جو حالات حاضرہ کے مطابق ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسا ملکی مسئلہ ہو جس پر قرآن کی روشنی میں تبصرہ کی ضرورت نہ ہو۔ ایک سنجیدہ تبصرہ کا ہر اخبار خیر مقدم کرتا ہے اور حکومت وقت بھی اس چیز کی خواہشمند ہے کہ تعمیری تبصرہ پبلک کی طرف سے پریس میں آئے۔ چنانچہ مواقع بے شمار ہیں' صرف ارادہ' ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ میں گذارش کر چکا ہوں کہ یہ کام Single-hand کرنے کا نہیں۔ اشد ضروری ہے کہ چند ذہین اور باہمت نوجوان اپنی زندگی اس کے لئے وقف کریں۔ ادارہ میں کچھ عرصہ زیر تربیت رہیں اور اس کے بعد ملک کے گوشوں میں پھیل جائیں۔ محنت مشقت اور جان و مال کی قربانی کے بغیر حضرات! کوئی

کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

اور یہ بھی اشد ضروری ہے کہ شہروں کے علاوہ دیہات کی طرف توجہ دی جائے۔ اس کے لئے سستے اور عام فہم لٹریچر کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ آپ نے کسی ذاتی یا سیاسی مقصد کے لئے نہیں کرنا' بلکہ ایک دینی فریضہ ادا کرنا ہے۔

حضرات! میں گذارش کر چکا ہوں کہ طلوع اسلام کا قوم پر بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دی ہے۔ طلوع اسلام کی تعلیم کا' جو دراصل قرآن ہی کی تعلیم ہے ایک نمایاں اور مفید ترین پہلو یہ ہے کہ یہ فرقہ پرستی کے خلاف ہے اور اس نے ایسا فارمولا قوم کے سامنے رکھا ہے جس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ قوم کے اندر وحدت پیدا کرنے کا طریق کیا ہے۔ میں اس وقت نظریات پر بحث نہیں کر رہا کیونکہ یہ چیزیں آپ حضرات کے سامنے تفصیل کے ساتھ آ چکی ہیں کہ قرآن فرقہ پرستی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ محترم پرویز صاحب نے نہ صرف از روئے قرآن فرقہ پرستی کو شرک ثابت کیا ہے بلکہ فرقہ پرستی کی لعنت کو دور کرنے کے لئے طریق کار بھی متعین کیا ہے جب انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ پہلے فرقے ختم ہوں اور پھر اسلامی آئین بنے بلکہ پاکستان کے آئین میں یہ شق داخل کی جائے کہ فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے جس میں آج کل مرحوم سیاسی پارٹیاں مدفون ہیں۔ لیکن میرا مقصد اس وقت صرف یہ گذارش کرنا ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو صدیوں کے بعد مسلمان کے سامنے پھر سے بے نقاب ہو کر آئی ہے اور یہ وہ سچائی ہے کہ آج نہیں تو کل بالآخر امت مسلمہ کو اس پر آنا پڑے گا اور فرقہ پرستی اپنی طبعی موت مر کے رہے گی اور یہ وہ دن ہوگا جب قوم کا ہر فرد محترم پرویز صاحب کا شکر گزار ہوگا اور یہ دن قوم کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھے گا۔

حضرات! اس ضمن میں ایک گزارش آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال کے مطابق بڑی اہم ہے۔ اس برصغیر میں بہت سی سیاسی اور غیر سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ ان میں سے ایسی تحریکیں بھی تھیں جو بڑے نیک مقاصد لے کر اٹھیں۔ ابتداء میں ہر ایسی تحریک پوری قوم کی تحریک بن کے ابھری۔ فرقہ پرستی کے خلاف رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ سمٹ سمٹا کر خود ایک فرقہ بن کے رہ گئی اور اس شدت سے فرقہ بنی کہ اپنے اندر سوائے ان لوگوں کے جو پہلے سے موجود تھے کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتی تھی۔ مجھے ان چیزوں کا ذاتی تجربہ ہے۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس برصغیر میں جو مفکرین گزرے ہیں ان میں علامہ اقبال مرحومؒ نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ اس لئے کہ وہ اپنے فکر کو عام کرتے گئے لیکن انہوں نے کوئی الگ جماعت نہیں بنائی۔ ایک تنظیم مقصود بالذات نہیں ہونی چاہئے بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہونا چاہئے۔ ہم خیال اصحاب کا کبھی کبھی مل بیٹھنا ضروری بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔ لیکن یہ اجتماعات صرف حصول مقصد کے لئے ہونے چاہئیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں محترم پرویز صاحب کے ہاں ہر جمعہ کی شام کو ایک کلاس ہوتی تھی جس میں مختلف قرآنی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ چونکہ اس کلاس کا وقت تین بجے شام یعنی جمعہ کی نماز کے فوری بعد ہوتا تھا۔ اس لئے ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ جمعہ کی نماز شہر میں پڑھنے کی بجائے یہیں (یعنی پرویز صاحب کے مکان پر) پڑھ لیا کریں۔ پرویز صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ہاں' مسجد قریب ہے یہاں آ کر پڑھ لیا کریں۔ بات بظاہر بڑی چھوٹی سی تھی اور آئی گئی ہو گئی لیکن دراصل ایک بہت بڑے راز کی حامل تھی۔ حضرات! اگر ہم نے جمعہ کی نماز کا اجتماع الگ شروع کر دیا تو سمجھئے کہ فرقہ بندی کی طرف پہلا قدم اٹھ گیا۔ چنانچہ یہ بڑی اہم بات ہے کہ تعلیمی اور مشاورتی امور کے علاوہ ہم ہر مسجد اور ہر سوسائٹی

میں پھیل جائیں اور کوئی مسلمان چاہے اسے نظریات سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو ہم سے دوری محسوس نہ کرے۔

حضرات! گزشتہ چند صدیوں میں سائنس نے ہر شعبہ میں بے انداز ترقی کی ہے۔ جہاں اس کے اکثر شعبے ایسے ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں وہاں چند شعبے ایسے بھی ہیں جن کی ترقی سے انسانیت کے لئے بڑے خطرات پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے بھروسے پر ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ انسان آج ستاروں کی دنیا سے آگے جانے کی فکر میں ہے لیکن انسانیت کے مسائل ابھی جوں کے توں پڑے ہیں اور انسان کی عظیم سائنٹفیک جدوجہد کا ماحصل ناکامی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے ذہن انسانی آج بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو دو چیزیں ایسی نظر آئیں گی جن کا انسان کے درجۂ انسانیت کو بلند کرنے میں بڑا حصہ ہے۔ مذہب اور سائنس۔ جس وقت بھی دنیا پر تاریکی چھائی کوئی نہ کوئی نبی مشعل راہ لے کر نمودار ہوا۔ سوسائٹی کی اصلاح کی۔ جہالت کو دور کیا نسلی اور جغرافیائی حدود کو توڑا اور انسانیت کو کامیابی اور سربلندی کا راستہ دکھایا۔ لیکن آج کا مذہب جہاں انسانی ذہن پر زنگار کا کام دے رہا ہے وہاں سائنس سے بھی سوائے Perversion کے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ انسان پھر اس حقیقت کو فراموش کر چکا ہے کہ **کان الناس امة واحدة**۔ مذہب آج کیوں بے اثر بن کر رہ گیا ہے۔ آج بیسویں صدی کے علم کے پیاسے اور طاقت کے بھوکے انسان کو کیوں مذہب سے رغبت نہیں رہی؟ اس لئے کہ مسلمان کی تراشیدہ ڈاڑھی۔ گرجے کی گھنٹی اور برہمن کی مالا میں ایک Scientific Mind کے لئے کوئی جاذبیت موجود نہیں۔ اس لئے آج کا سائنٹسٹ مذہب کو ایک بے حقیقت شے سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اہل مذہب کے نزدیک سائنس ایک ایسی شے ہے جس نے انسان کو خدا سے دور کر دیا ہے۔ لیکن آج اہل مذہب کا اہل سائنس کے خلاف آواز اٹھانا چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ایسی طاقت جس نے ارتقائے انسانی میں ایک بڑا اہم رول Play کیا ہو اسے گھٹیا قرار دینا اور اس کی مخالفت کرنا سوائے حماقت کے اور کیا ہے بالخصوص جب مخالفت ایک ایسے فریق کی طرف سے ہو جس میں ایک مذہب دوسرے کے خلاف' ایک مذہب کا ہر فرقہ دوسرے کے خلاف اور ایک فرقے کے افراد کا انداز فکر الگ الگ ہو۔ دوسری طرف سائنس جس کے اصولوں کی حیثیت Universal ہو' جس میں ہر اصول کو ایک کسوٹی پر پرکھا جائے اور ساری سائنٹیفک دنیا اسے بیک وقت اپنائے' تو ایسی صورت میں اہل مذہب اہل سائنس کے آگے کیسے ٹھہر سکتے ہیں اس کا نتیجہ Intelligentsia کے اندر مذہب سے بیزاری ہے۔ گو اہل مذہب جہلاء کے اندر اب بھی اندھے کی لاٹھی گھمائے چلے جا رہے ہیں۔ حضرات ایسے دور میں جب کہ Science Vs Religion کا یہ عالم ہو اور ان دونوں کے اختلافات کو Exploit کرنے کے لئے Petty-minded politician اپنے پورے حربے استعمال کر رہا ہو۔ طلوع اسلام کا یہ کھول کھول کر بیان کرنا اور از روئے قرآن ثابت کرنا کہ اسلام مذہب نہیں ہے بلکہ ایک Social Order ہے اس سوشل آرڈر کی Structure کیا ہے۔ سائنس کا مقام اس سوشل آرڈر میں کیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات کس طرح عین دین کے مطابق ہیں اور ان تحقیقات کو جب قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی روشنی میں Apply کیا جائے تو یہ کس طرح انسانیت کی تباہی کے بجائے انسانیت کے لئے باعثِ رحمت بن جاتی ہیں۔ یہ طلوع اسلام کی تعلیم کا بڑا روشن پہلو ہے جس پر جس قدر بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ اے کاش

ہمارے پاس اتنے وسائل موجود ہوں کہ ان نظریات کو دنیا کے سامنے اس انداز سے رکھ سکیں جس کے یہ مستحق ہیں۔

طلوع اسلام نے قرآن کے اکثر ایسے گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اگر ساری امت کے سامنے بے نقاب ہو جائیں تو جس بھنور میں اس کی کشتی صدیوں سے پھنسی ہوئی ہے اس سے نکلنے کا فوری راستہ مل سکتا ہے۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے قرآن کی روشنی دکھا کر زمین پر ذاتی ملکیت کے تقدس کو ملیامیٹ کر دیا۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے اس حقیقت کو جو حرف قل العفو میں پوشیدہ تھی نمودار کیا۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے Islamic Ideology کے خط وخال واضح طور پر قوم کے سامنے رکھے۔ درآنحالیکہ قوم کا کوئی بڑے سے بڑا تیس مارخاں پاکستان بننے کے بعد یہ نہ بتا سکا کہ آخر اس مملکت کے حصول کا مدعا کیا تھا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کے نعرے کا مفہوم اگر کسی نے قوم کے سامنے رکھا تو طلوع اسلام اور صرف طلوع اسلام تھا۔ وحدت امت کا مفہوم اگر کسی نے قوم کو سمجھایا تو وہ طلوع اسلام تھا۔ یہ تخیل کہ فرد اپنی تمام صلاحیتوں کو نہ صرف اپنی پرورش بلکہ امت کی پرورش کے لئے صرف کرے۔ اگر فرد ایسا نہیں کرے گا تو نہ صرف اس کی اپنی بلکہ پوری ملت کی ارتقاء رک جائے گی۔ کس قدر حسین اور بلند تخیل ہے اور نوع انسانی کی مشکلات کا کتنا بڑا حل ہے۔ یہ نظریہ کہ بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عدل کا مفہوم ہر فرد کی نشوونما کے پورے مواقع بہم پہنچانا ہے اور احسان کا مفہوم جہاں کسی فرد کی نشوونما میں کمی رہ جائے اس کو پورا کرنا ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا کتنا انقلاب انگیز پہلو ہے یہ کہ اسلامی مملکت میں مقصود بالذات مستقل اقدار کا تحفظ ہے اور یہ کہ Secular State کا مقصود ملک اور قوم کا تحفظ ہے چاہے اس مقصد کے حصول کے ذرائع کچھ بھی ہوں۔ یہ کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے اپنی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ کہ انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی وجہ سے واجب التکریم ہے۔ یہ کہ ہر شخص کے مدارج اس کے ذاتی جوہر اور کام کی رو سے مقرر ہوتے ہیں۔ یہ کہ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو قانون خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہو۔ یہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے سے اپنا حکم منوائے حکم صرف اللہ کا ہے۔ یہ کہ کتاب کی وارث ساری امت ہے چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ساری امت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عملی انتظام کی سہولت کے لئے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر **فیکم رسول** کے سلسلے کو قائم رکھتی ہے۔ اور یہ کہ رسول ﷺ کی زندگی کے بعد **فیکم رسول** سے مراد ملت کی مرکزی Authority ہے جو رسول کا فریضہ یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے اور یہ کہ پیشوائیت کی Institution کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ کتنے بڑے حقائق ہیں جن سے اگر قوم کو کسی نے آشنا کیا تو صرف طلوع اسلام نے کیا۔

دوسری طرف قرآن کا یہ گوشہ کہ وحی کا سلسلہ صرف انبیاء تک محدود ہے۔ اور یہ کہ عام انسانوں کا تعلق صرف خدا کے قانون کے ساتھ ہے' براہ راست خدا کے ساتھ نہیں۔ یہ ان تمام چور دروازوں کو بند کر دیتا ہے جن کے ذریعہ خود ساختہ نبی' اولیاء' پیر فقیر حشرات الارض کی طرح نمودار ہوتے ہیں اور ملت کے جسم کے ساتھ جونکوں کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوس چوس کر نڈھال کرتے رہتے ہیں۔ طلوع اسلام کی آواز سب سے پہلی آواز ہے جس نے تاریخ کے ان

بھیانک پردوں کو تار تار کیا جن کے اندر صدیوں سے اسلام چھپا تھا۔

حضرات! یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ یہ قرآن کے گوشے بڑی مدت کے بعد بے نقاب ہو کر سامنے آئے ہیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم لوگ اس دور میں پیدا ہوئے جب قرآن کی روشنی پر سے بادل چھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔ جب قرآن مسجد کے طاقوں اور غلافوں کے اندر سے نکل کر Intelligentsia کے Study-rooms میں پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔ اسے ملتِ اسلامیہ پر پھر سے بہار کا آغاز سمجھئے۔ لیکن پھول کھلنے تب شروع ہوں گے جب ہم سب مل کر ہمت اور استقلال کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں گے۔ جب ہم اپنی حالت خود بدلنے پر آمادہ ہو جائیں گے تو رحمتِ ایزدی یقیناً ہمارے شاملِ حال ہوگی۔ والسلام۔

آپ کی شکایت

یہ بھی درست کہ رسالہ نہیں پہنچا یا وقت پر نہیں ملا اور یہ بھی کہ تعمیل ارشاد میں تاخیر ہوئی یا اس میں کوئی فروگزاشت ہوئی۔

لیکن کیا آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ آپ نے

۱۔ تبدیلی پتہ کی بروقت اطلاع دی ہے یا نہیں۔ ۲۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھا ہے یا نہیں۔

۳۔ زرِ شرکت ادا ہوا ہے یا نہیں۔ ۴۔ اپنے علاقے کے پوسٹ کوڈ کی اطلاع دی ہے یا نہیں۔

اہم اعلان

ادارہ طلوع اسلام کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ طلوع اسلام کی

فی شمارہ قیمت 25 روپے

سال بھر کے لئے قیمت 300 روپے۔ (ادارہ طلوع اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان اور دین اور سیاست

حنیف رامے (مرحوم) نے پرویز صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو لیا تھا جس کی روئیداد انہوں نے اپنے جریدہ ماہنامہ نصرت لاہور میں شائع کرنے کے لئے مرتب کی تھی۔ آج ان کی یاد میں اس انٹرویو کو قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

حنیف: اگر کسی کو یہ یادگار نعرہ بھول نہیں گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا: ''لا الٰہ الا اللہ'' تو وہ شاید انکار نہ کر سکے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ لیکن پچھلے سترہ سال میں کئی مرتبہ یہ کوشش ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ کبھی کسی بڑے مصنف نے حکم لگایا کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا۔ ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی' معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ کبھی کسی بڑے وکیل نے ثبوت مہیا کیا کہ اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ مسلمانوں کے متعدد فرقوں میں اسلامی قوانین کے تعین پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے' جو ایک کے نزدیک معروف ہے وہ دوسرے کے لئے منکر ہے۔ اس طرح ہم میں اندر ہی اندر ایک منافقت پرورش پاتی رہی جس کے تحت ہم نہ تو اسلام کا نام لینا چھوڑ سکے اور نہ ہم نے اس کی روشنی میں اپنی سیاسی' معاشرتی اور معاشی راہیں تراشنے کی سبیل کی۔ پھر ایک دن آیا کہ ملک کے نام سے اسلامیہ کا لفظ اڑ گیا۔ منافقانہ اسلامیت سے یہ علانیہ غیر اسلامیت بہتر تھی۔ لیکن جن عوام کو ساتھ ملانے کے لئے خواص نے ایک مرتبہ اسلام کا نام لیا تھا وہ ابھی اس واقعے کو نہ بھولے تھے بلکہ برسوں کی سیاسی بیوست' معاشرتی ہلچل اور معاشی استحصال کو وہ اسی امید پر برداشت کرتے آئے تھے کہ کبھی تو اس مملکت خداداد پر اس قانون کی حکومت کے دن آئیں گے جس کا اسوہ نبی کریم ﷺ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے ضد کی اور اسلامیہ کا لفظ اس ملک کے نام میں دوبارہ شامل ہو گیا۔

اب پچھلے دنوں ہم نے ایک انقلاب آتے دیکھا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ایک طرف تو آفاق پر دشمن کی یلغار تھی اور دوسری جانب انفس میں خدا جاگ رہا تھا۔ وہ خدا جو نیٹشے کے الفاظ میں مر چکا تھا' ہمارے دل و دماغ کے گرد بادوں سے ابھر کر اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آیا کہ ہم نے اور ہمارے لشکروں نے باقاعدہ خدائے ذوالجلال کے زیر کمان اپنے غنیم سے ٹکر لی اور جرأت و جوان مردی کے تازہ و تابندہ باب لکھے۔

آج یہ حالت ہے کہ ہمارے اندھوں کو بھی انسانی معاملات میں خدا کی کارفرمائی کا یقین آ چکا ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ایک لمحے کو خوابِ خرگوش سے بیدار ہونے والی قوم ایک مرتبہ پھر چونک کر کروٹ بدل چکی ہے۔ اگر ہم نے اس لمحۂ بصیرت کو پہلے کی طرح ضائع کر دیا تو یہ اپنے ساتھ ظلم ہوگا۔

قرآن عظیم کے ایک ورق گردان کے طور پر میں آپ

سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست، معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اس در پر اور اس در پر، کبھی اس چیز کی اور کبھی اس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ، پُر وسعت معانی، اسکے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لئے خدا کی وحدت آفرین رسی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں۔ وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہم کنار رکھتی ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دور حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرن اول میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس سے ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امت تھے۔ ان کا ایک نظام تھا۔ سب کے لئے ایک قانون تھا۔ اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امت کی وحدت ختم ہوگئی۔ اس میں مختلف فرقے پیدا ہوگئے (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے بالفاظ صریح شرک قرار دیا ہے) ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا۔۔۔ یعنی ایک ایسا ضابطۂ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس مشکل کے حل کے لئے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لئے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے صریح کفر ہے)۔ سیاست سے متعلق قوانین ارباب حکومت کے سپرد کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) ارباب مذہب کی تفویض میں دے دیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات) کے فیصلے کر لیا کریں۔ اس سے ارباب حکومت بھی خوش ہوگئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور ارباب مذہب بھی راضی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا۔ نقصان صرف اتنا ہوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھا۔ ہر ایک کا "اسلام" الگ الگ ہوگیا۔ ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر فارم (Secular Form) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بعینہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامت دین قرار دے دیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے لئے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلام) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عائد کر دیئے گئے ہیں۔ ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابل فہم ہو سکتا ہے لیکن جب اس قسم کی باتیں قوم کے دانشمند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن

اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی۔ اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔

ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرم ﷺ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو از سر نو زندگی اور حرکت عطا کی جا سکے۔ سطح بیں نگاہوں اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب و اذہان کے لئے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خاردار وادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے، لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی۔ سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آ جایا کرتا تھا جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے، دین خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو، جس میں دین خالص اپنی حقیقی منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے، محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظام حیات بنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی حیات اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے یہی ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اگر خدا کی اس کتاب عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہد نبی اکرم ﷺ میں وجہ سرفرازی انسانیت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو موجودہ الجھاؤ سے نکالنے کے لئے ایک ایسے جرأت مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لئے ہوئے اٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ

حسبنا کتاب اللہ۔

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

یہی تھا وہ اجمال جس کی تفصیل قائداعظمؒ نے (۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں) ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ

> ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے..... اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔''

قرآن کریم کی تعلیم کا انداز یہ ہے کہ اس میں (بجز چند احکام کے جن کا تعلق بیشتر انسان کی عائلی زندگی سے ہے) زندگی کے مختلف تقاضوں

کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں اور امت مسلمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ امور کے لئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں' باہمی مشاورت سے' جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ اس طرح اس امت کا نظام خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کا دامن پکڑے ہوئے نہ صرف زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہوا بلکہ ان کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہوگا اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں..... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں..... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔''

قرآن کریم کا یہ انداز اس طریق کے عین مطابق ہے جسے آج کل سائنٹیفک طریق کہا جاتا ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ سائنٹسٹ تجرباتی طریق سے قوانین مرتب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ سائنٹسٹ قوانین فطرت مرتب نہیں کرتے' فطرت کے قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔ ان قوانین کے متعلق' جنہیں اساسی قوانین (Axioms) کہا جاتا ہے۔ سائنٹسٹ یہ بتا ہی نہیں سکتے کہ وہ کس طرح دریافت ہوئے تھے۔ سائنس ان قوانین کو بطور حقیقت ثابتہ تسلیم کر کے انہیں اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتی ہے اور اس تحقیق کے نتائج کو پیش آمدہ حالات پر منطبق کرتی ہے۔ سائنس کا تعلق خارجی کائنات سے ہے اور دین کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعیہ سے۔ جن قوانین کو سائنس کی دنیا میں (Axioms) کہا جاتا ہے دین کے نظام میں وہ مستقل اقدار یا وحی کے عطا کردہ اساسی اصول کہلاتے ہیں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ یہ تھا اسلام کا وہ بنیادی تصور جس کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔

تشکیل پاکستان کے بعد سے میری یہی کوشش رہی کہ مملکت کے دستور میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے ایک طرف حکومت کا سیکولر انداز بھی ختم ہو جاتا تھا اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا وہ اقتدار بھی باقی نہ رہتا تھا جو اسے شخصی قوانین کے دائرے میں اس وقت حاصل ہے۔ اس لئے میری دعوت کی مخالفت دونوں طرف سے ہوئی۔ سیکولر نظام کے حامی تو کھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے لیکن مذہبی پیشوائیت کے لئے میدان وسیع تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ تو نہیں کہا (نہ ہی وہ ایسا کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتے تھے) کہ قرآن کی آمد سے ان کی تھیا کریسی ختم ہو جاتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے نازک جذبات کا سہارا لے کر یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ انکار سنت ہے' یہ (معاذ اللہ) انکار رسالت ہے۔ میں اس مقام پر اقرار و انکار سنت کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ ہمارے پیش نظر موضوع سے متعلق نہیں' لیکن اتنی بات تو حنیف صاحب! بادنیٰ تدبر واضح ہو جائے گی کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا یہی نقشہ تھا کہ مملکت میں پبلک لاز الگ

ہوں اور پرسنل لاز الگ۔ پبلک لاز حکومت کے زیر اقتدار ہوں اور پرسنل لاز مذہب کے دائرے میں۔۔۔ اور پھر پرسنل لاز میں ہر فرقے کا مسلک الگ الگ ہو اور اس طرح امت کے تفرقے کو مستقل سند حاصل رہے۔ اسلام کا یہی نقشہ ان حضرات کے نزدیک عین مطابق سنت ہے اور یہ نقشہ کہ قوانین میں کسی قسم کی تفریق نہ ہو' سب کا سرچشمہ خدا کی کتاب ہو اور یہ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں منطبق ہوں تا کہ امت کا تفرقہ اور انتشار ختم ہو کر اس میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے ان کے نزدیک خلاف سنت ہے' اور اس کا نام انکار رسالت ہے۔ فرمائیے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے!

بہرحال ان مخالفتوں کے علی الرغم میں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ ہمارے ہاں یہ اصول آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآن کریم پر ہوگی جو تمام فرقوں کے مسلمانوں میں قدر مشترک ہے۔ جب ۱۹۶۲ء کے آئین کی ترتیب کا سوال زیر غور تھا تو حکومت کی طرف سے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس سوالنامے کے جواب میں اس بنیادی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس اصول پر خاص زور دیا تھا۔ لیکن جب آئین مرتب ہو کر سامنے آیا تو اس میں ''قرآن'' کی بجائے ''اسلام'' کا لفظ لکھا تھا۔ تھیا کریسی کے حامیوں نے اسے بعد میں ''کتاب وسنت'' کے الفاظ سے بدلوالیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

جس منافقت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ سیکولر نظام حکومت کے حامی دل میں اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ''اسلام'' ہو یا ''کتاب وسنت'' اس سے قیامت تک کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور سے ہو سکے۔ (اس لئے کہ ''اسلام'' کی طرح ''سنت'' کا مفہوم بھی ہر فرقے میں الگ الگ ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اتباع سنت کے مدعی حضرات آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں اونچی آواز سے آمین کہنا مطابق سنت ہے یا خفی آواز سے۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اس مسلک کی رو سے کبھی یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکے جو ان تمام حضرات کے نزدیک یکساں طور پر قابل تسلیم ہو؟) لہٰذا یہ طبقہ مطمئن ہے کہ نہ اسلامی قوانین مرتب ہوں گے نہ مملکت اسلامی بنے گی۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس طرح ایسا ضابطۂ قوانین تا حشر مرتب نہیں ہوسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک ''اسلامی'' کہلا سکے۔ اس لئے ان کی فرقہ بندی اور پرسنل لاز کے دائرے میں ان کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس سے دونوں گروہ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن سیکولر انداز کا حامی گروہ یہ کہہ چھوڑتا ہے کہ فرقوں کا اختلاف قانون سازی کی راہ میں حائل ہے اور مذہبی پیشوائیت یہ طعنہ دے چھوڑتی ہے کہ ارباب حکومت چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور ''اسلامی قوانین'' سے ان کی مراد ہوتی ہے شراب' جوئے' ریس اور زنا کی ممانعت یا عورتوں کی بے حجابی یا مردوں کے کلب اور جم خانے وغیرہ پر بندش۔ یعنی وہ اخلاقی برائیاں جن کے بارے میں ان کے تمام فرقے متفق ہیں۔ لیکن جن امور میں ان حضرات میں باہمی اختلاف ہے ان کا ذکر کبھی نہیں آئے گا۔ ان سے پوچھئے کہ یہ اخلاقی برائیاں قرآن کریم کی رو سے جرائم ہیں لیکن فرقہ بندی' اس کی نص صریح کے مطابق شرک ہے' آپ جرائم کی روک تھام کے لئے قانون سازی پر تو اس قدر زور دیتے ہیں لیکن اس شرک کو ختم کرنے کے لئے آپ کی طرف سے کبھی اشارہ تک نہیں ہوتا بلکہ اگر حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی کوشش ہوتی ہے تو آپ حضرات اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کوشش کو ناکام بنائے بغیر چین نہیں لیتے۔ مثلاً ۱۹۶۲ء کے آئین میں پرسنل لاز سے متعلق مختلف فرقوں کے الگ الگ قوانین کے تصور کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور انہوں نے آئین کی اس شق کو

بدلوا کر اس کی جگہ فرقہ وارانہ تعبیر کی شق داخل کرالی۔

گذشتہ ستمبر کے قیامت خیز ہنگامے میں ہمارے قوم کے دل میں جو بے پناہ جذبہ پیدا ہوا ہے اور اس نے جو محیرالعقول کارنامے کر دکھائے ہیں۔ وہ نتیجہ ہیں اسلام کے ساتھ اس گہرے لگاؤ کا جو ہمارے عوام کے تحت الشعور میں خوابیدہ چلا آ رہا ہے اور جو اس قسم کے تصادمات کے وقت یک دم بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ متاع بیش بہا ہے اور اسے عمدہ تعمیری مقاصد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے پیش نظر جو سوال ہے اس کا تعلق جذبات سے نہیں، علم و بصیرت اور تفقہ و تدبر سے ہے۔ سوال زیر غور یہ ہے کہ پاکستان میں وہ نظام زندگی کس طرح متشکل کیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا؟ اور ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہمارے عوام کے یہ جذبات بھی اس سے پہلے ضائع جاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی متعین مقصد نہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ عوام بیچارے نہایت خلوص نیت سے یہ قربانیاں ''اسلام'' کی خاطر دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ابھی تک یہی متعین نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہمارے ہاں ہر ذہن میں اسلام کا الگ مفہوم ہے۔ عوام کی اسلام کے ساتھ یہ محبت ایک نادیدہ محبوب کے ساتھ عشق کے مترادف ہے۔ یعنی اقبالؒ کے الفاظ میں ہماری قوم کی کیفیت یہ ہے۔۔۔ دلے دارند و محبوبے ندارند۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ جذبہ لاشعوری طور پر کام کرتا ہے قوم بے پناہ قربانیاں دیتی چلی جاتی ہے اور جب وہ اس پر شعوری طور پر نگہ بازگشت ڈالتی ہے اور اپنے گردوپیش دیکھتی ہے تو اسے کچھ اور ہی نظر آتا ہے اور یوں ان کا وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کا ردعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ عوام کے اس قیمتی جذبے کو مستقل شعار بنانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم متعین کر کے اسے عملی نظام کی شکل میں متشکل کیا جائے جس کے حسین و خوشگوار نتائج اسے ان کی نگاہوں میں دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز بنا دیں اور یوں وہ اس کے تحفظ و بقا کی خاطر ہر قربانی کے لئے نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ہر وقت تیار ہوں۔

باقی رہے وہ حضرات جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا، ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا، تو ان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ اس سے تحریک پاکستان کے قائد (محمد علی جناح) کے متعلق جس کردار کا تصور یہ حضرات پیش کرتے ہیں وہ تصور قائداعظمؒ کے دشمنوں تک نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کے خلاف بہت کچھ کہا لیکن اتنا کہنے کی جرأت کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ''منافق'' تھا۔۔۔ اور منافق بھی ایسا جو حصول مقصد کی خاطر اسلام جیسے مقدس جذبے کی آڑ لے رہا تھا، اسے (Exploit) کر رہا تھا۔ جدوجہد آزادی کے دس سالہ دور میں قائداعظمؒ کی تقاریر، تحریرات، بیانات، خطوط وغیرہ کو دیکھئے۔ وہ مسلسل اور متواتر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ اس مطالبے کی بنیاد ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں تو بر بنائے مذہب۔ ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں تو اس لئے کہ

> ''ہم اس میں اپنے ضابطہ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔''

وہ واضح طور پر بتاتے رہے کہ:

> ''پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور

اصولات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔''

جب پوچھا جاتا کہ تشکیل پاکستان سے ہوگا کیا تو وہ جواب میں کہتے:

''اس سے یہ آواز فضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گذشتہ کو از سرنو زندہ کرے گی۔''

آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ ایک دفعہ (۱۹۴۱ء) میں مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ سے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ سیاست میں مذہب کو کیوں گھسیٹ لائے ہیں' تو اس کے جواب میں انہوں نے برملا کہا تھا کہ:

''میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو' مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا رہ کیا جاتا ہے!''

قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی امتیاز کے متعلق جو کچھ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں بتایا تھا اس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں۔

ہمارے یہ پاکستانی کرم فرما کہتے ہیں کہ جناح نے اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے چپکا رکھا تھا ورنہ اس کا مقصد کسی اسلامی مملکت کا قیام نہیں تھا۔ لیکن سنئے کہ اس زمانے کے ہندو کیا سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

''آپ کو کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیں! نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنالیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہو گا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔''

ہندو تو قائداعظمؒ کے اسلامی نعرے کو حقیقت پر مبنی سمجھتا تھا اور ہمارے یہ مسلمان بھائی اسے ''دروغ مصلحت آمیز'' سے تعبیر فرماتے ہیں!

پھر اس کا کیا جواب کہ جب پاکستان بن گیا اور (بقول معترضین) قائداعظم کے پیش نظر وہ مصلحت یا ضرورت نہ رہی جس کے تابع وہ اپنی ہر بات کے ساتھ اسلام کا نام چپکائے رکھتے تھے تو انہوں نے اس وقت بھی اسلام کا نام نہ چھوڑا۔ انہوں نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اور (جو غالباً ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں انہوں نے کہا تھا:

''ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کرسکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلامی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضے سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچالے جائے اور نوع انسان کی بہبود و مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔''

یہ تھی جناح کی آخری پکار جب اسے کسی 'مصلحت آمیزی' کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے شک مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی بہبود چاہتا تھا لیکن صرف قرآنی نظام کی رو سے' جس میں آج بھی یہ قوت موجود ہے کہ وہ ہر اس قوم کو جو اسے اپنا مسلک زندگی قرار دے لے نہ صرف مادی سرفرازیوں سے ہمکنار کردے بلکہ شرف انسانیت

کی معراج کبریٰ تک پہنچا دے۔۔۔ ''یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔''

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے ''نصرت'' کے گذشتہ شماروں میں جناب منظور قادر سے میرا ایک انٹرویو دیکھا ہو گا۔ منظور قادر صاحب نے جس نقطۂ نظر سے دین اور سیاست کے رشتے پر بات کی ہے وہ بظاہر آپ کے نقطۂ نظر کے قریب قریب برعکس ہے۔ انہوں نے اسلام کے مروجہ تصورات کو دیکھ کر یہ کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی یا معاشرتی قالبوں میں ڈھالنے سے ہمارے ہاں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن کیا ان کی یہ رائے آپ سے قریب نہیں کہ یہ فضا اسلام کے بارے میں مروجہ تصورات کی بنا پر ہے۔

پرویز: میں نے اس انٹرویو کی روئیداد ''نصرت'' میں دیکھی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے افسوس ہوا اور یہ اس لئے کہ میرے دل میں منظور قادر صاحب کی قانونی قابلیت کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک بلند پایہ وکیل ہیں اور مملکت پاکستان میں وزیر خارجہ بھی رہ چکے ہیں۔ نیز مغربی پاکستان کی عدلیہ کے چیف جج بھی۔ ایک وکیل اور جج کی حیثیت سے مقدمات میں ان کے سامنے ہر قسم کا رطب و یابس پیش ہوتا ہے' جھوٹے دعوے دائر کئے جاتے ہیں' جھوٹی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں اور انہیں اصل اور سچی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ منظور قادر صاحب کا منصب یہ ہے کہ وہ غلط کو صحیح اور جعلی کو اصلی سے الگ کریں اور پھر پیش نظر مقدمے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچیں۔ مجھے افسوس اس بات سے ہوا کہ چھوٹے چھوٹے مقدمات تک میں تو وہ اس طریق کار کو اختیار کرتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے ''اسلام کا مقدمہ'' پیش ہوا تو انہوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور جو باتیں اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کے سامنے پیش کی گئیں اسے انہوں نے عین اسلام قرار دے دیا اور پھر اس کے خلاف ڈگری صادر کر دی۔ انہوں نے خدا' رسول' وحی' عبادت' گناہ' ثواب' توبہ' صدقہ وغیرہ کے خلاف اپنے اعتراضات کی بنیاد ان باتوں پر رکھی جو' معاف فرمائیے' ہمارے ہاں داستاں سرا واعظوں اور قصہ گو خطیبوں کے یہاں یا پکی روٹی جیسی کتابوں میں لکھی ملتی ہیں۔

حنیف: پرویز صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد اسی اسلام سے واقف ہیں جو پکی روٹی اور واعظوں کے خطبوں سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اگر منظور قادر صاحب نے کہا ہے کہ اسلام کی مروجہ شکلیں اس لائق نہیں کہ ان سے وہ نتائج پیدا ہو سکیں جن کی ہمیں آرزو ہے تو کیا وہ حق بجانب نہیں؟ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ منظور قادر صاحب خود بھی اکثر مروجہ عقائد سے مطمئن نظر نہیں آتے۔

پرویز: اگر منظور قادر صاحب یہ فرما دیتے کہ ان کے اعتراضات ان عقائد' تصورات اور رسومات کے خلاف ہیں جنہیں آج کل اسلام کے نام سے موسوم کر کے پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تنقید حق بجانب ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں کچھ نرم سی تصور کی جاتی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ۔۔۔ بالارادہ یا بلاارادہ' وہ حقیقی اسلام کے بعض بنیادی تصورات تک کو بھی اپنی تنقید کی زد میں لے آئے ہیں اور اس تنقید کی بنیاد وہ عقائد و تصورات ہیں جو ہمارے ہاں بلاسند و تحقیق متوارث چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی تیئس سالہ زندگی میں جو جو واقعات سامنے آئے قرآن نے ان کے متعلق ہدایت دی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ اس تیئس سال کے عرصے میں محدود واقعات ہی سامنے آ سکتے تھے' سب کے سب نہیں۔ نیز نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد واقعات کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا' ہر نئے دن نت نئے واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن میں دی ہوئی راہنمائی اس زمانے کے لئے تو کافی ہو سکتی تھی' یہ نہ تو ابدی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ایسی مکمل کہ گذشتہ' موجودہ اور آنے والے تمام واقعات و

حوادث کو محیط ہو سکے۔ یہ تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور (جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے) مبنی ہے ''شان نزول'' کے نظریئے پر۔ لیکن اگر موصوف ''مروجہ اسلام'' سے قطع نظر کر کے خود قرآن کریم پر غور فرما لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ''شان نزول'' کا نظریہ خود قرآنی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ قرآن کریم اس کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ یہ وہی دین ہے جسے خدا نے نوحؑ کو دیا۔ ابراہیمؑ کو دیا۔ موسیٰؑ کو دیا' عیسیٰؑ کو دیا' تمام سابقہ انبیاء (علیہم السلام) کو دیا۔ سو جو دین روز اول سے چلا آ رہا تھا اس کے متعلق یہ کہنا دین کی حقیقت سے بے گانگی کی دلیل ہے کہ وہ مجموعہ ہے ان ہدایات کا جو ان واقعات کے پیش نظر دی گئیں جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور اس معاشرے میں پیش آئیں اور بس اور پھر جس دین کے متعلق قرآن میں یہ کہہ دیا گیا ہو کہ وہ تمام نوع انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو محیط نہیں ہو سکتا' قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے۔

قرآن کریم میں دی ہوئی ہدایات کے متعلق منظور قادر صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ (Trial and Error) کے تجرباتی طریق کا نتیجہ تھیں' وحی کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے (Trial and Error) عقل انسانی کا طریق ہے جو مستقبل کا علم نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس وحی ہے جو عقل انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اس خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کا علم حدود فراموش ہے۔ لہٰذا اسے عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ منظور قادر صاحب کے اس دعوے کی بنیاد ''ناسخ و منسوخ'' کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ عقیدہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ اس کے لئے بطور مثال انہوں نے شراب کی ممانعت سے متعلق قرآنی احکام پیش کر کے فرمایا کہ دیکھئے! یہ احکام کس طرح بتدریج آئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ (Trial and Error) کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت اتنی فرصت نہیں کہ میں شان نزول یا ناسخ و منسوخ جیسے نظریات پر تفصیلی بحث کروں' نہ ہی اس کا تعلق آپ کے سوال سے ہے' البتہ ممانعت خمر سے متعلق احکام والی مثال کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تدریجی احکام (Trial and Error) کے استقرائی طریق کا نتیجہ نہیں تھے' اس سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ افراد میں جو برائیاں اس طرح زمین گیر ہو چکی ہوں کہ ان کا ایک دم استیصال طبعی طور پر ناممکن ہو ان کی اصلاح بتدریج کرنی چاہئے۔ شراب جس شخص کی گھٹی میں پڑ چکی ہو اس کے لئے اس کا یک لخت چھوڑ دینا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس کی یہ عادت بتدریج چھڑانی چاہئے۔ یہ تھی مصلحت اس قسم کے احکام کو بتدریج نافذ کرنے کی۔ چنانچہ اگر ہمیں آج بھی اپنے معاشرے میں شراب کو بند کرنا ہو تو اس کے لئے قرآن کریم کا تجویز کردہ تدریجی طریق ہی اختیار کرنا ہوگا۔

حنیف: پرویز صاحب! مہربانی سے ذرا دو ایک مثالوں سے واضح کریں کہ قرآن حکیم اپنے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی' معاشرتی اور معاشی تقاضوں سے کیونکر عہدہ برا ہوتا ہے۔

پرویز: جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے قرآن کریم کے ابدی اصول اس چار دیواری (Boundary Lines) کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر زمانے میں عملی پروگرام خود وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ (و امرھم شوریٰ بینھم) ''امت مسلمہ کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اصولی حکم بھی دے دیا کہ (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون) ''جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق

فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں' کافر ہیں۔'' ان اصولی ہدایات کے پیش نظر ہمارا طریق کار یہ ہوگا کہ جو معاملہ ہمارے سامنے آئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اس راہنمائی کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورے سے یہ طے کیا جائے کہ اس معاملہ کے متعلق ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس باہمی مشورے کا طریق عمل کیا ہوگا' یہ حالات کے ساتھ بدلتا جائے گا۔۔۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں جب وسائل رسل و رسائل محدود تھے' اور طریق تھا۔ آج اس کا طریق اور ہوگا۔ مشاورتی نظام کا اصول غیر متبدل رہے گا۔ البتہ اس نظام کی عملی شکل حسب ضرورت بدلتی جائے گی۔ یا مثلاً قرآن کریم کی اصولی راہنمائی یہ ہے کہ تمام افراد اور ان کی اولاد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی نظامِ معاشرہ کے ذمے ہو گی۔ (نحن نرزقکم و ایاھم)۔ اب یہ کام نظام معاشرہ کا ہوگا کہ وہ فیصلہ کرے کہ معاشی نظام کی ہیئت کیا ہو جس کی رو سے کوئی فردِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی اور سامان نشوونما سے محروم نہ رہے۔ اس نظام کی شکلیں حسب ضرورت بدلتی جائیں گی۔ لیکن یہ اصولی مقصد اپنی جگہ قائم رہے گا۔

حنیف: شراب کی حرمت پر بات کرتے ہوئے آپ نے بعض معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے قرآن کے تدریجی طریق کار کا ذکر کیا ہے۔ میں ایک ضمنی سوال کا موقع نہیں کھونا چاہتا۔ قرآن کریم میں معاشرتی جرائم کے لئے سزائیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً چوری کے سلسلے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی انتہائی سزا ہے نہ کہ ابتدائی۔ کیا حرمت شراب کی طرح سزاؤں کے سلسلے میں بھی منزل بہ منزل چلنے کا حکم نہیں۔ اور کیا منزل بہ منزل چلنا اس لئے ضروری نہیں کہ جرائم کا معاشرتی نظام کے حالات سے اٹوٹ تعلق ہے۔ یہ تو دھاندلی ہوگی کہ معاشرتی حالات تو بے شک غیر اسلامی ہوں اور سزائیں اسلامی دینی شروع کر دی جائیں۔

پرویز: آپ نے صحیح سمجھا ہے کہ قرآن کریم نے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ انتہائی ہیں۔ لیکن اس سے کم تر یا تدریجی سزائیں اس نے خود متعین نہیں کیں۔ اسے اس نے حالات کے مطابق نظام معاشرہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ سزا تجویز کرتے وقت متعدد حالات و کوائف کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔۔ مثلاً معاشرے کی عام اخلاقی سطح' معاشی حالات کے تقاضے' خود ملزم (یا مجرم) کی نفسیاتی کیفیت' اس کی تعلیم و تربیت اور ماحول و عواطف کے اثرات وغیرہ۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ قرآن کریم نے لونڈیوں کے لئے زنا کی سزا آزاد عورتوں سے نصف مقرر کی ہے اور اضطراری حالت میں ان چیزوں کے کھا لینے کی بھی اجازت ہے جو عام حالات میں حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ وہ اصول تھا جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو کوئی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر خوراک کی چوری کی تھی بلکہ سزا ان کے مالکوں کو دی تھی کہ ان کے جرم کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر تم انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے تو یہ کیوں چوری کرنے پر مجبور ہوتے! لہٰذا غیر اسلامی معاشرے میں اسلامی سزائیں اَن مِل بے جوڑ سی بات ہے۔ اسلام کے اصول و احکام' مؤکدات و تنبیہات' اوامر و نواہی' فرائض و واجبات' حقوق اور ذمہ داریاں اسلامی نظام معاشرہ کے مختلف پرزے ہیں۔ یہ اسلامی نظام کے اندر اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نظام نہ ہو تو ان کی کیفیت ایک مشینری کے بکھرے ہوئے پرزوں کی سی رہ جاتی ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ (فادخلوا فی السلم کافۃ) ''تم اس نظام خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' اور اس کے برعکس سختی سے کہا ہے کہ ''کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا

کہ تمہیں اس دنیا میں ذلت وخواری نصیب ہوگی اور آخرت میں عذاب شدید۔'' (البقرہ:۸۵)۔

لیکن یہ ٹھیک ہے کہ جب ہم اپنی موجودہ سطح سے ابتدا کریں گے تو اس معاشرے کے انتہائی نقطے تک بتدریج پہنچیں گے۔ اس نسبت سے ہمیں جرائم اور ان کی سزاؤں کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ سزا تو ایک طرف' حضرت عمرؓ نے ایک ذمی کا یہ کہہ کر ٹیکس واپس کر دیا تھا کہ تم ابھی حال ہی میں اس حکومت کے زیر حفاظت آئے ہو' اس نے تمہارے لئے کیا کیا ہے جو تم اس کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے آ گئے ہو!

باقی رہا دین اور سیاست کا اٹوٹ رشتہ' سو اس کے متعلق بھی ہمارے یہ معترضین ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس تعلق کی وضاحت ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں ایک اصولی حکم دیا گیا ہے کہ (لا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا) ''کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔'' یہ ہمارا دین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی حالت میں اور کسی قوم کے سلسلے میں بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی وقت اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کی بارگاہ میں مجرم قرار پاتا ہے۔ اور اگر (معاذ اللہ) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس اصول کو نہیں مانتا تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔ یہ ہے وہ دین جسے سیاست سے الگ کر دیا جائے ''تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔ اس کے برعکس وہ سیاست ہے جس میں ہر معاملے کا فیصلہ ''مصلحت'' پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سیاست کے نہ کوئی غیر متبدل اصول ہوتے ہیں نہ اٹل ضوابط۔ ''مصلحت'' کے مطابق اصول وضوابط مرتب ہوتے ہیں اور مصلحت ہی کے مطابق ان میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جس سے دنیا اس قدر مادی ترقی کے باوجود جہنم بن رہی ہے۔

حنیف: جب ہم عمل کے میدان میں دین اور سیاست کے رشتے کی کڑیاں تلاش کرتے ہیں تو اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو زیر بحث لانا لازم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر اچھائی کا حامل اسلام جمہوریت کی خوبیوں سے بھی متصف ہے۔۔۔ اسلام کے دامن میں جمہوریت کی خوبی باہمی مشورے کے حکم کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن جہاں تک جمہوریت کے مروجہ نظام کا تعلق ہے سیاسی جماعتوں کے بغیر اس کا تصور بھی لوگوں کے لئے محال ہے اور ادھر اسلام ہے کہ وہ کسی قسم کے تفرقے یا پارٹی بازی کا متحمل نہیں۔ اس صورت میں آپ کے نزدیک ہمارے دین اور ہماری سیاست کے درمیان کون سا مقام اتصال ہے جہاں جمہوریت سے وابستگی کا شوق بھی پورا ہو سکے اور وہ راہ بھی ہم سے نہ چھوٹے جو خدا نے سورہ المائدہ میں اسلام کے نام سے ہمارے لئے چنی تھی۔

پرویز: حنیف صاحب! جس طرح اسلام ایک اصطلاح ہے اسی طرح موجودہ سیاست میں جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ان مباحث کے متعلق صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ متعین طور پر معلوم کر لیں کہ قرآن کریم کی رو سے ''اسلام'' کا مفہوم کیا ہے۔ جب یہ متعین ہو جائے تو اس کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ ''جمہوریت'' کی اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پیش نظر سوال پر غور کیا جا سکے۔

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کی اصطلاح بہت مبہم ہو چکی ہے اور اس کا آپ کے نزدیک یہ حل ہے کہ ہم قرآن حکیم کو اپنے لئے حکم سمجھیں' اس سے ہمیں ایک ایسا نقطہ یا مرکز مل جائے گا جس پر حسن اتفاق سے سب کا ایمان ہے اور جس پر تاریخ نے کوئی تحریفی اثر نہیں ڈالا۔ لیکن باوجود اس خواہش کے کہ میں اس مقام پر آپ کو کسی اختلافی بحث میں نہیں الجھانا چاہتا مجھے یہ کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی جسے خود

قرآن کریم نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور ایک حد تک ہمارے لئے اپنے اوراق میں محفوظ بھی کر دیا ہے' قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصطلاح پر روشنی نہیں ڈالتی؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کے بارے میں بھی اگر ہمیں قرآن ہی سے روشنی مل جاتی ہے تو پھر حکم تو قرآن ہی ٹھہرا۔ لیکن کیا ایک جیتا جاگتا رسول' ایک عبد اور بشر' ایک سربراہ مملکت' ایک سپہ سالار' وحی کا حامل' وحی کا مبلغ اور وحی کا نافذ کرنے والا ایک نبی اسلام کا ایک بنیادی ستون نہیں؟ اور کیا قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ مل کر اسلام کے تصور کو معین اور واضح نہیں کر دیتے؟

پرویز: قرآن حکیم کی رو سے رسول کا فریضہ محض ایک ایلچی یا ڈاکیہ کا نہیں ہوتا کہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیا اور بس۔ اس کے ساتھ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ان اصولوں پر عمل کر کے ان سے ایک معاشرہ متشکل کرے اور یوں دنیا کو دکھا دے کہ یہ اصول ناممکن العمل نہیں۔ قرآن کریم نے اسی لئے نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا اہم ترین حصہ اپنے دامن میں ابدی طور پر محفوظ کر دیا تا کہ آنے والے انسانوں کو یہ معلوم ہو کہ ان اصولوں پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضورؐ نے قرآن کریم کے الفاظ میں اپنے بشر ہونے کو نمایاں طور پر بیان کیا جس سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ حضورؐ یہ کچھ ایک نبی کی حیثیت سے نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے کہ اگر یہ کچھ ایک نبی ہی کر سکتا تھا تو پھر حضور ﷺ کی سیرت نوع انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار نہیں پا سکتی تھی۔

پھر قرآن کریم نے خود نبی اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا تھا کہ: مشاورھم فی الامر۔ معاملات میں اپنی امت کے افراد کے ساتھ مشورہ کیا کرو اور یہ ظاہر ہے کہ جماعت مومنین کے یہ افراد انسان ہی تھے' فوق البشر نہیں تھے۔ لہٰذا قرآن کریم کے پیش کردہ نقشے کے مطابق اسلام کا جو نظام محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کر کے دکھایا وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے والے افراد کا کارنامہ تھا اور یہی چیز ہمارے لئے نمونہ بنتی ہے۔ بنابریں اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اس اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا ہے' اس کا تو خود قرآن نے حکم دیا ہے۔ قرآن کریم میں اسلام کا تصور مکمل طور پر موجود ہے لیکن حروف کی شکل میں۔ اس تصور کو عملی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ تصور اپنی جگہ مکمل' واضح اور غیر متبدل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس پر عمل اپنے اپنے زمانے میں ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہتے ہیں جو آج بھی قائم ہو سکتی ہے۔

اب میں آپ کے اصلی سوال کی طرف آتا ہوں۔ ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام سے مفہوم ہے زندگی کا وہ عملی نظام جو قرآن کریم میں دیئے ہوئے نقشے کے مطابق متشکل ہو۔ اب لیجئے ''جمہوریت'' کو' میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اس اصطلاح کو اس شدومد سے استعمال کرتے ہیں ان کے پیش نظر جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کی مشینری ہوتی ہے۔ جمہوریت کی مغربی اصطلاح سے مفہوم یہ ہے کہ

قانون سازی کا مطلق حق قوم کو حاصل ہے۔

اور اس کی مشینری سے مراد ہے وہ طریق کار جس کے مطابق قوم اپنا یہ حق استعمال کرتی ہے۔ مثلاً طریق انتخاب' پارلیمانی یا صدارتی نظام' حزب موافق و مخالف کا وجود وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک مغربی جمہوریت کے مندرجہ بالا اصول کا تعلق ہے یہ اسلام کے اصول حکمرانی کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلق حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔ نہ سلطان کو' نہ کسی ڈکٹیٹر کو نہ قوم کو' نہ اس کے نمائندگان کو' نہ پارلیمان کو' نہ صدر مملکت کو۔ یہ حق ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں اور جن میں ردوبدل کا اختیار

کسی کو بھی حاصل نہیں۔ جو قانون ان اصولوں سے ٹکرائے گا' وہ قوم کے نمائندگان کی کثرت آراء سے تو ایک طرف' اگر ساری قوم کے اتفاق رائے سے بھی مرتب ہوا ہوگا تو بھی اسلامی نظام میں مردود قرار پائے گا۔

اب رہا جمہوری مشینری کا سوال۔ سو اس کی جزئیات میں سے جو شق قرآنی تعلیم سے متصادم نہیں ہوگی اسے اختیار کیا جا سکے گا۔ جو اس کے خلاف ہوگی اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ قرآن کریم کی واضح تعلیم کی رو سے مذہبی فرقوں کا وجود شرک (الروم:۳۱) اور سیاسی پارٹیوں کا وجود سیاست فرعونی کی ایجاد (القصص:۴)۔ لہٰذا امت کی مجلس مشاورت میں حزب اقتدار اور حزب مخالف کا وجود قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ امت مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلے میں خود ایک پارٹی ہے جسے قرآن نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کے مخالف گروہ کو حزب الشیطان۔ قرآن کریم میں انہی دو گروہوں کا ذکر ہے۔

امت اپنے منتخب افراد پر مشتمل مجلس مشاورت (پارلیمان) مرتب کرے گی تا کہ وہ سوچیں اور فیصلہ کریں کہ قرآن کریم کے قوانین کو عملاً کس طرح نافذ کیا جائے۔ یہ ان تمام افراد کا مشترکہ مقصد زندگی ہوگا اس لئے اس میں پارٹیوں کا سوال کیا؟ پیش آمدہ معاملے کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کرے گا۔ ان آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس اختلاف کے معنی ہیں معاملے کے مختلف گوشوں کا سامنے آنا تا کہ فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد جو فیصلہ ہوگا اس کی عملی تنفیذ اس پوری جماعت کا متحدہ فریضہ ہوگا۔ اس نظام میں نہ کسی پارٹی کو اقتدار حاصل ہوتا ہے نہ ان کے سامنے مختلف اصول ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر جماعت مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے۔ اقتدار قرآن کا اور اس کی عملی تشکیل کی ذمہ دار پوری کی پوری جماعت مومنین کی۔ یہ ہے ''اسلامی نظام جمہوریت''۔

حنیف: پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن میں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا نظام بھی اس مشورے کی ایک کوشش ہے۔ جو لوگ مروجہ جمہوریت کو اسلام کی رو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے لئے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریت کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ کیا اس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی جمہوریت کے بلا پارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو مروجہ جمہوریت کی بنیادی کل ہیں۔

پرویز: جب میں نے ۱۹۶۲ء کے دستور میں دیکھا کہ امت میں سیاسی پارٹیوں' یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو میں نے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا اس لئے کہ میرے نزدیک قرون اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی معین کردہ منزل کی طرف اٹھا تھا۔ پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام درحقیقت مشاورت کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ اوپر تک اٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیہ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصے کو صحیح مانتے ہو اور دوسرے سے انکار

کرتے ہو تو یاد رکھو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جس حصے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج حاصل ہو جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت وخواری نصیب ہو گی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریت کی تنظیم کے جو اچھے نتائج متوقع ہو سکتے تھے وہ ''پارٹی ساز جمہوریت'' کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس باب میں' حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں' یعنی وہ نظام جس کے لئے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا تھا۔۔۔ تو ہمیں اسی نظام کو خالصتاً نافذ کرنا ہوگا لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمت نہیں پاتے تو پھر ہمیں کھلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہئے تا کہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یہ گومگو کی زندگی۔۔۔ یہ منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن کا انداز۔۔ تو عذاب الیم ہے۔ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرز زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے' اگرچہ وہ نتائج بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے۔ لیکن منافقت کو' جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمت ہو' اس نے بدترین طرز زندگی قرار دیا ہے اسی لئے اس نے کہا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے۔

میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً ہی جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر معین کر کے اسے مملکت پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں۔ یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ۔

حنیف: نارتھروپ نے اپنی تازہ کتاب ''فلسفیانہ انسانیت اور سیاست حاضرہ'' میں کلکھون اور سارو کن کی تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مختلف اقوام کے قوانین اور عمل کے قالب ان کے فلسفۂ حیات سے پھوٹتے ہیں۔ خواہ وہ شعوری طور پر اس فلسفے سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ ہر قوم زندگی کے تجربات کو تصورات میں ڈھالتی ہے اور یہی تصورات اس کے سیاسی' معاشرتی اور معاشی اداروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے قرآن عظیم کی صورت میں کائنات' انسان اور ملت اسلامیہ کے بارے میں واضح تصورات موجود تھے۔ لیکن جب ہم اپنے سیاسی' معاشرتی اور معاشی قالبوں کو دیکھتے ہیں تو یا قرآن کی تعلیم پر شک گزرتا ہے یا یہ خیال آتا ہے کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض لوگ بڑے خلوص کے ساتھ یہ احساس رکھتے ہیں کہ اسلام کی مروجہ تعلیم اور اس کے تحت قائم ہونے والا تصور ذات باری' تصور دعاء' تصور انصاف ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ اس سے جو حالتیں ابھر سکتی تھیں وہ ابھر چکی ہیں اور اگر ہمیں بہتر نتائج کی توقع ہے تو ہمیں اسلام کی تعلیم کے بارے میں اپنے تصورات پر نظر ڈالنی ہوگی کہ وہ کس حد تک صحیح بنیادوں پر استوار ہے؟

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر ہم نے قرآن کی تعلیم کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے تو کیا کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر چلتے ہوئے ہم اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں ہمارے بنیادی تصورات کا سرچشمہ قرآن قرار پائے اور کیا یہ راستہ لازمی طور پر ان پتھروں سے پٹا ہوا ہے جو ہم گالیوں اور کفر کے فتوؤں کی صورت میں ہر مصلح دین پر اٹھاتے رہے ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ ہم نے یہاں سرسیدؒ اور اقبالؒ کو بھی اس انعام سے نوازا۔

پرویز: یہ درست ہے کہ بنیادی تصورات ہی وہ سرچشمہ ہیں جس

سے کسی قوم کا تمدن اور کلچر جنم لیتا ہے۔ دین ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن سے ایک انسانیت ساز معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی تصورات دیئے تھے۔ لیکن دین کے تصورات مفاد پرست گروہوں کے لئے پیغام مرگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ تصورات مٹا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایک بڑی گہری سازش وجود میں آتی ہے اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے۔ جب فرعون دیکھتا ہے کہ میں صاحب ضرب کلیم کا حریف نہیں ہو سکتا تو وہ ہامان کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ بنیادی تصورات کے الفاظ کو تو اس طرح رہنے دیتی ہے لیکن ان کا مفہوم یکسر بدل دیتی ہے۔ اس سے وہ تصورات اصل دین کی ممی شدہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملتے جلتے کچھ اور الفاظ تراشتی ہے اور ان پر تقدس کا غلاف چڑھا کر انہیں بھی خدائی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ ہم ان تصورات کے حامل ہیں جو دین نے عطا کئے تھے لیکن درحقیقت وہ ان تصورات کی قبروں کے مجاور بن کر رہ جاتے ہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ہماری پوزیشن اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس نے ان تصورات کو پیش بھی کیا تھا اور ان کا مفہوم بھی خود ہی معین کر دیا تھا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام اتنا ہے کہ ہم ان تصورات کا مفہوم قرآن کریم سے معین کر لیں اور ان کے غیر قرآنی مفہوم کو جھٹک کر الگ کر دیں۔ اس سے دین کے اصل تصورات ہمیں پھر سے وہ توانائی عطا کر دیں گے جو نہ صرف ہمیں خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے گی بلکہ دنیا میں ایک عالمگیر انسانیت نواز انقلاب پیدا کر دے گی۔

لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ مفاد پرست گروہ چاہتے ہی نہیں کہ ایسا ہو اس لئے وہ مذہب پرستی کے لبادے میں ہر ایسی کوشش سے ٹکرا جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے کفر کے فتوؤں سے نوازتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی تصورات کو ایک چلا ہوا کارتوس قرار دیتے ہیں ان کے سامنے اسلامی تصورات نہیں بلکہ مفاد پرست گروہوں کے تراشیدہ تصورات ہوتے ہیں جن پر اسلامی ٹھپا لگا دیا گیا ہے۔ اگر ان کے سامنے دین کے اصلی تصورات اور ان کا صحیح مفہوم آ جائے تو وہ دیکھیں گے کہ یہ تصورات کس قسم کا حیات بخش نظام پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے سب سے بنیادی تصور لا الٰہ الا اللہ کو لیجئے۔ اس کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اسے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرنی چاہئے۔ یہ تصور جس قدر عظیم انقلاب کی بنیاد ہو سکتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ''الٰہ'' کے معنی پرستیدہ اور عبادت کے معنی پرستش کر لئے جائیں تو اس سے جذبات کی حد تک تو ہم تسکین پا سکتے ہیں، اس تصور کا عملی طور پر زندگی سے کوئی واضح تعلق نہیں رہتا۔ قرآن کا کام درحقیقت مذہب کے تراشیدہ تصورات کو خدا کے عطا کردہ تصورات سے بدلنے کا ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم ان پتھروں سے بھی بچ جائیں جن سے ہر مصلح کا راستہ پٹا پڑا ہے اور انسانوں کے خود ساختہ تصورات کو قرآنی تصورات سے بھی بدل دیں۔

میرے عزیز بھائی! میرے نزدیک، یا یوں کہئے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا کے ہر فرعون، ہر ہامان اور ہر قارون سے جنگ مول لینا ہے۔ اور یہ جنگ ایسی ہے جس میں مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ہم لا الٰہ نہیں کہتے الا اللہ پر آ ہی نہیں سکتے۔ یہی انبیاء کا راستہ تھا اور یہی راستہ ہر اس شخص کو اختیار کرنا ہو گا جو اس قسم کا ارادہ رکھتا ہے۔ لا الٰہ

میں ہر غیر خداوندی بت کو پاش پاش کرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ان بتوں کے پجاری اپنے معبودوں کو نیست و نابود ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

حنیف: قرآن حکیم نے ایک جگہ کہا ہے:

''کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ کچھ پیش نہ آئے گا جو تم سے پہلوں کو پیش آیا۔ انہیں مصائب و آلام نے گھیر لیا اور وہ طوفانِ حوادث میں یوں تھپیڑے کھاتے رہے کہ نبی اور اس کے رفقاء پکار اٹھے کہ اے اللہ! تیری نصرت کب آئے گی۔'' (البقرہ: ۲۱۴)۔

خداوند کریم نے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کے ذکر کا جو التزام برتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے آزمائش و ابتلاء کو مومن کی زندگی کا لازمہ گردانا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ درد پیدا ہوا کہ ہم نے اسلام کی آسان تعلیم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے انہوں نے میرے خیال میں یہ احتیاط نہیں برتی کہ کہیں اس شوق تسہیل (Over Simplification) کے فطری نتیجے کے باعث اپنے مقتدیوں کو اس راہ پر ڈال دیں کہ وہ راہ حق ہی کو آسان سمجھ بیٹھیں۔ تعلیم کے بارے میں تو قرآن نے خود بہت تاکید سے اپنے یسر یا آسان ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے عمل کی کٹھنائیاں تو کم نہیں ہو جاتیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ تعلیم کو مشکل بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ تعلیم کے سلسلے میں۔۔۔ (Over Simplification) بھی اسلام کے ساتھ زیادتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایسے گھرانوں کو اسلامی شعائر کی بڑے اعتماد سے توہین کرتے دیکھا جس میں قرآن کے یسر ہونے کا غلط تصور پیدا ہو گیا ہے۔ انہیں صوم و صلوٰۃ جیسے احکامات میں وقت کا اور خیرات میں مال کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ ادھر عملی سطح پر وہ دو تقریریں اور چار پمفلٹ پڑھ کر اسے تدبر اور تعقل کی معراج سمجھتے ہوئے دوسرے تمام مسلمانوں کو بے علم بلکہ گمراہ گردانے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی حالت کچھ ایسی ہے جیسے ایک نسل پیشتر ان لوگوں کی تھی جو کمیونزم سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ لوگ بحث تو مارکس کا نام لے لے کر کرتے تھے حالانکہ داس کیپیٹال کے درشن بھی انہیں نصیب نہ ہوئے تھے مگر نقد علم کمیونزم پر چند مفت بٹنے والے کتابچوں پر مبنی تھا۔

پرویز: غلط روش پر چلنے والی قومیں ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھلاتی رہتی ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں پہلے قرآن کریم کو ایسا مشکل بتایا گیا کہ اس کا سمجھنا ''گپت ودیا'' سے کم مشکل نہ تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کے الفاظ کی تلاوت حصول ثواب کے لئے کافی سمجھ لی گئی اور حصول جنت کو اس قدر آسان بنا دیا کہ اس کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ ''جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے''۔ (ابوداؤد)۔ اور طاعون یا اسہال سے یا ڈوب کر مرنے سے شہادت کا درجہ عطا ہو جاتا ہے (نسائی)۔ اب جھولا نیچے آیا تو قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے اتنے سے غور و فکر کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی جتنی مثلاً شیکسپیئر کے سمجھنے کے لئے۔ باقی رہا عمل سو اس کے لئے یہ برہموسماجی عقیدہ اپنا لیا گیا کہ اصل بات ''نیک عملی'' ہے۔ جس عمل کو کوئی نیک سمجھے اسے کر لیا کرے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔

دین ایک عالم گیر انقلاب کا داعی ہے جس کے لئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لینی ناگزیر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی ہی مجاہدانہ حرارت کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کے صحیح انقلاب آفرین تصورات واضح اور معین شکل میں معاشرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں اور اسے بتا دیا جائے کہ اس راہ میں کتنے خطرناک مقامات آتے ہیں لیکن اس کی منزل کس قدر حسین

اور تابندہ ہے۔اس کے بعد افراد معاشرہ سے کہہ دیا جائے کہ یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنے لئے فیصلہ کیجئے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے گی یا نہیں۔ یونہی سراب آسا تخیلات کے ماتحت زندگی بسر کر کے نہ اپنے آپ کو دھوکا دیجئے نہ دین کو۔ نہ خود ذلیل ہو جیئے نہ اسلام کو بدنام کیجئے۔

حنیف: پرویز صاحب! میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔آپ نے برسہا برس تصنیف وتالیف کے ذریعے سے اور اپنے درس کے سلسلے کی وساطت سے لوگوں کے سامنے اپنے خیال کے مطابق دینی تصورات کی صحیح شکل رکھنے کی کوشش کی ہے۔کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ کی اس کوشش نے' کہ دین کے اس بنیادی تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے' بعض لوگوں میں یہ جھوٹا اعتماد پیدا کر دیا ہے گویا وہ اسلام کی کنہ تک پہنچ گئے ہوں۔ کیا آپ کے مشاہدے میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کے چند پمفلٹ پڑھ کر یا چند تقریریں سن کر اور ان سے متاثر ہو کر بعض لوگ اپنے ہمسایوں سے اس انداز میں بحث مباحثہ کرنے چل دیتے ہیں کہ انہوں نے تو دین کی روح کو پالیا ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں نے شروع ہی سے اس قسم کے خدشات کو بھانپ لیا تھا اور اسی لئے میں نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی۔ میں اپنی قرآنی فکر کو فضا میں بکھیرتا چلا جاتا ہوں اور اس سے مختلف مقامات پر مختلف نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اختلاف قارئین اور سامعین کے اختلاف مقاصد کا نتیجہ ہے۔بعض لوگوں کا مقصد اپنی پندار (اَنا) کی تسکین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔انہوں نے میری تعلیم سے ایسی باتیں لے لیں جن سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے ہم عصروں پر اپنے علم وفضیلت کی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔یہی ان کا مقصد تھا' یہ انہوں نے پالیا۔لیکن اس گروہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے اندر میری فکر نے طالب علمانہ جذبے کو ابھارا ہے۔ وہ حقائق کو از خود سمجھنے کے لئے انتہائی محنت کرتے ہیں لیکن ان کے طالب علمانہ عجز کا یہ عالم ہے کہ ان پر نیوٹن کے اس مقولے کا اطلاق ہوتا ہے:

''ہم علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے چن رہے ہیں۔''

لیکن میری کوششوں کا حاصل اس سے بڑھ کر ایک اور ہے اور وہ یہ کہ اب فضا میں قرآن کی آواز عام ہو رہی ہے حتیٰ کہ اپنے تو ایک طرف' مجھے گالیاں دینے والے بھی مجبور ہو رہے ہیں کہ اپنے سامعین کے سامنے کچھ خدا لگتی باتیں کیا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی ایک اچھے انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔

حنیف: پرویز صاحب! مجھے تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں بہت گہرے اور ہمہ گیر معانی پائے جاتے ہیں۔لیکن غور کرنے پر بعض تصورات کی حد تک روایتی توجیہات بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔مثلاً میرے خیال میں صلوٰۃ کا ہرگز اتنا مفہوم نہیں ہے کہ چند رکعت نماز ادا کر لی جائے لیکن جب صلوٰۃ کے وسیع تر معانی پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے تو بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دو رکعت والی نماز سے انسان بالکل غافل ہو جاتا ہے۔اس سلسلے میں کیا آپ کے فکر نے بھی بعض اس طرح کے نتائج پیدا نہیں کئے؟

پرویز: حنیف صاحب! دین میرے نزدیک زندگی کے ایک عملی نظام کا نام ہے اور جہاں تک ان ارکان اسلام کا تعلق ہے جن کی سند قرآن کریم سے ملتی ہے وہ اس نظام کے ستون ہیں' یا یوں کہئے کہ اس کے پروگرام کے لاینفک اجزا ہیں۔اگر وہ دین کے نظام کے تحت ادا ہوں تو ان کے حسین نتائج سامنے آتے ہیں اور اس طرح ان کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور ان کی اہمیت بھی۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہے تو پھر ارکان کی شکل و صورت تو باقی رہ جاتی ہے' ان کی روح باقی نہیں رہتی۔ میرا پیغام یہ

ہے کہ ان ارکان کو پھر سے دین کا جز بنایا جائے تا کہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں موجودہ حالات میں بھی' جب کہ وہ نظام موجود نہیں' ان ارکان کو اسی شکل میں قائم رکھنے کے حق میں ہوں اور اس کی تاکید بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم میں جب بھی احساس زیاں بیدار ہوا' انہی ارکان کے ''حشر اجساد'' سے ہمیں حیات نو عطا ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہیں کرتا تو اس پر میرا کوئی جبر نہیں۔ حقیقت یہ ہے حنیف صاحب! میں نے اپنی پوزیشن صرف ایک مبلغ کی رکھی ہے' داعی یا کسی جماعت کے امام کی نہیں رکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اس سے بھی متفق نہیں ہوسکتا کہ چونکہ دین کے صحیح تصورات پیش کرنے سے لوگوں کی نظروں میں ان بے روح رسومات کی اہمیت کم ہونے کا خدشہ ہے اس لئے دین کی صحیح شکل سامنے لانی ہی نہیں چاہئے۔ میرے ''حلقۂ سخن'' میں ایسے ارباب فکر و عمل بھی موجود ہیں جو ان ارکان کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت کرتے ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ جب یہ ارکان اسلام کے نظام کے اجزا بنے تو ان سے کس قدر خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے۔

حنیف: قرآن حکیم نے ایمان کو عمل پر اولیت دی ہے۔ عمل کی اہمیت کو اس نے بے شک بے حد اجاگر کیا ہے' لیکن عمل صالح کا سرچشمہ ایمان ہی کو قرار دیا ہے اور ایمان انسان کا اجتماعی مسئلہ نہیں ذاتی مسئلہ ہے۔ ہمارا عمل بے شک اجتماعی قالبوں میں ڈھل سکتا ہے لیکن ایمان ہم اپنے اندر اتر کر ہی لا سکتے ہیں' یہ نہ تو خوف سے پیدا ہوتا ہے' نہ جبر سے' نہ معاشرے کی ملامت سے' نہ تقلید سے۔ اس نظر سے دیکھیں تو فرد کی اہمیت اداروں سے اولین ہے۔ لیکن آج کل ایک انداز فکر یہ ابھر رہا ہے کہ اداروں کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے اور معاشرے کی اہمیت کو اتنا بڑھایا چڑھایا جاتا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے شریک ٹھہرنے میں شاید ہی کوئی کسر رہ جاتی ہو۔

اس انداز فکر کا ایک مظہر یہ ہے کہ سارا زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ افراد کو معاشرتی قوانین میں جکڑنے کے لئے دھڑا دھڑ قانون سازی کی جائے' چنانچہ ملک میں سیاست کا بازار اس بہانے گرم کیا جاتا ہے کہ قانون ساز اداروں کے لئے چناؤ ہوگا۔ پھر ملک بھر کے بے خبر' بے درد اور غیر ذمہ دار لوگوں کو قانون سازی کے اعزاز میں دھڑے بندیوں' مفاد پرستیوں اور دھاندلیوں کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ بحثیں ہوتی ہیں کہ اسلامی قانون بن سکتا ہے یا نہیں۔ مناظرے ہوتے ہیں کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ قانون سازی کا یہ تماشا ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا کہ افراد کو اندر سے بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ قانون کا احترام تو خدا کے خوف سے' اس کے قول فیصل پر ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ ایمان ہی موجود نہیں تو قوانین کی زنجیریں ریت کے رسوں سے بھی کمزور ثابت ہوں گی۔

Polanyi کا برسوں کا کام Personal Knowledge اس امر پر دال ہے کہ فرد ہی تمام تر معاشرتی ترقی کا سرچشمہ ہے اور علم کا حصول افراد ہی کے ذریعے سے ممکن ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں قوانین صرف افراد سے متعلق ہیں لیکن اجتماعی مسائل کے لئے اصول دیئے گئے ہیں۔ فرد کے حقوق تو اتنے اہم سمجھے گئے کہ انہیں خدا نے خود متعین کر دیا لیکن معاشرتی معاملات کو اصول بتا کر ان کی تشکیل کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

میں یہ باتیں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کیونکہ آپ کے بارے میں عام احساس یہ ہے کہ آپ معاشرے کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔

میں اس مقام پر آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسانی

زندگی میں فرد اور معاشرے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اور کیا فرد کو بدلے بغیر معاشرے کو بدلنا ممکن ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا افراد کو نظر انداز کر کے اداروں کی تشکیل کا جتن گاڑی کو گھوڑے سے پہلے جوتنے کے مترادف نہیں؟

اور کیا:

عبس و تولیٰ o ان جاء الا عمیٰ o وما یدریک لعله یزکیٰ o (۳-۱/۸۰)۔ کی آیات معمولی سے معمولی فرد کو بھی پوری اہمیت دینے کا واضح حکم نہیں؟

پرویز: جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ افراد نہ ہوں تو معاشرہ کہاں سے بنے گا؟ اس لئے بنیادی اہمیت افراد ہی کو حاصل ہے۔ صحیح ایمان سے افراد کے اندر جو تبدیلی واقع ہو گی اس کا مظاہرہ معاشرے میں ہوگا۔ افراد کی تعلیم و تربیت اس لئے نہایت ضروری ہے۔

لیکن ہمارے ہاں دین کا تصور ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور ہم نے اسے ''مذہب'' کے مرادف المعنی سمجھ کر اسے انفرادی مسئلہ بنا لیا ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا پرائیویٹ تعلق۔ میری بصیرت کے مطابق یہ تصور قرآنی نہیں۔ دین اجتماعی نوعیت کا نظام ہے اس لئے وہ امت کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں تا کہ دین کا صحیح تصور ان کے سامنے آ سکے۔ میری پیش کردہ فکر میں جو معاشرہ پر زور دیا جاتا ہے تو اس سے یہ مقصد ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ اگر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار پر ہو تو اس سے محیر العقول انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں۔۔ اور یہ بات کسی دوسرے اجتماعی نظام سے ممکن نہیں۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے اسلام اپنے لئے ایک الگ مملکت چاہتا ہے' اپنی آزاد حکومت چاہتا ہے۔ میں دین کے اسی تصور کو اجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں۔ ورنہ اگر دین خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق ہی کا نام ہوتو اس کے لئے نہ الگ مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اپنی آزاد حکومت کی۔

جب دین کے تصورات اور ان کے انسانیت ساز جنت بداماں درخشندہ نتائج کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لیا جائے تو اس سے اس ایمان کی ندیاں رواں ہو جاتی ہیں جن کا سرچشمہ قلب انسانی کی گہرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔ لیکن صحیح تعلیم و تربیت تو آنے والی نسل کی ہو سکتی ہے (اس کے لئے میں اٹھارہ برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں)۔ جن افراد پر ہمارا موجودہ معاشرہ مشتمل ہے وہ موجودہ نہج پر پختہ ہو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس معاشرے میں اسلامی اقدار کو کیسے رائج کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام قانون کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔ اس کے لئے معاشرے میں قرآنی قوانین کا نفاذ کیا جانا ضروری ہے۔

جو لوگ تعلیم و تربیت سے قطع نظر کر کے محض حکومت کے ڈنڈے سے اسلامی معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں وہ میرے نزدیک یہودی شریعت کے تصور کو تو کچھ سمجھتے ہیں لیکن نبی اکرم ﷺ کے معلم ہونے کی حیثیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔

اس مقام پر شاید کہہ دیا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے جماعت کی تشکیل کی تھی قانون کا اعلان ان پر بعد میں کیا گیا تھا لیکن تم موجودہ مسلمانوں پر قانون کا اطلاق ضروری سمجھتے ہو' اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کو مسلمان کیا تھا اور انہیں مسلمان کرنے کا طریقہ تعلیم و تربیت تھا۔ اس لئے اس وقت جو معاشرہ متشکل ہوا تھا وہ تھا ہی ان مسلمانوں پر مشتمل جو تربیت یافتہ تھے۔ لیکن ہمارے ہاں صورت اس کے برعکس ہے۔ یہاں پہلے سے ایک معاشرہ موجود ہے جو مسلمانوں پر مشتمل

ہے۔لیکن یہ مسلمان وہ ہیں جو تعلیم و تربیت کے بعد مسلمان نہیں ہوئے' وہ بس مسلمان ہیں۔ان کی آئندہ نسل کو تو اسی طرح ''مسلمان کرنا'' چاہئے جس طرح نبی اکرم ﷺ نے دوسروں کو مسلمان کیا تھا۔ یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعے۔۔۔لیکن موجودہ مسلمانوں کو علیٰ حالہٖ نہیں چھوڑا جا سکتا' انہیں لامحالہ کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔تو وہ قانون اور ضابطہ اسلامی کیوں نہ ہو؟ اس سے بھی بڑی حد تک معاشرتی اصلاح ہو جائے گی۔

میں اسے پھر واضح کر دوں کہ افراد اور معاشرے کا تعلق ایک مشین کے پرزوں اور خود مشین کا تعلق ہے جب تک پرزے صحیح حالت میں نہ ہوں گے مشین صحیح کام نہیں کرے گی۔لیکن پرزے بھی تو اسی وقت اپنا مقصد پورا کریں گے جب وہ مشین کے اندر فٹ ہوں گے۔ایک پرزہ اپنی ذات میں کتنا ہی اصلح اور گراں بہا کیوں نہ ہو اگر وہ مشین سے باہر رکھا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔اس کا عدم وجود برابر ہے' اور مشین کے اندر ایک معمولی سا پیچ بھی اپنا مقام رکھتا ہے اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

دین کا نظام وہ مشینری ہے جس کے اندر ہر پرزہ (افراد معاشرہ) اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا فریضہ ادا کرتا اور یوں اپنی ہستی کا مقصد بروئے کار لاتا ہے۔اس مثال میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مشین کے پرزے بے جان ٹکڑے ہوتے ہیں جو میکانکی طور پر مصروف نقل و حرکت رہتے ہیں۔اس کے برعکس افراد معاشرہ ذی حیات اور قابل نشوونما نفوس ہوتے ہیں۔اس نظام کے اندر ان کی نقل و حرکت بالارادہ ہوتی ہے جس سے خود ان کی صلاحیتوں میں بھی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔یعنی جہاں اسلامی نظام کا مجموعی نتیجہ عالمگیر انسانیت کے لئے سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا ضامن ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اس سے خود افراد معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی جلا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔اس طرح اس نظام اجتماعی کے اندر ان افراد کی انفرادیت گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔یوں یہ نظام خود ان افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بن جاتا ہے۔یہ چیز دنیا کے کسی اور نظام میں ممکن نہیں۔دنیا میں جہاں فرد ہوتا ہے وہاں نظام کا تصور نہیں ہوتا۔(مذاہب عالم میں یہی کیفیت ہوتی ہے) اور جہاں نظام ہوتا ہے وہاں فرد باقی نہیں رہتا (جیسے مغرب کے جماعتی نظاموں میں ہو رہا ہے)۔یہ خصوصیت اسلامی نظام ہی کی ہے کہ اس میں نظام خود افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے۔فرد اور معاشرے کا یہی وہ تعلق ہے جسے اقبال نے اس حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ

زندگی انجمن آراء و نگہدار خود است
ایکہ در قافلہ ای باہمہ روبے ہمہ شو

حنیف: خداوند کریم نے قرآن میں انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کی آیات کو آفاق و انفس میں تلاش کرے۔جہاں تک آفاق کا تعلق ہے علوم و فنون کی راہ سے' سمع و بصارت اور ذہن کی راہ سے انسان اس قائم بالحق کائنات میں اللہ کے واضح اور نت کھلتے چلے جانے والے نشانات دیکھتا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔جہاں تک انفس کا تعلق ہے علمی سطح پر نفسیات نے عموماً اور تحلیل نفسی نے خصوصاً کچھ راہیں تراشی ہیں۔پھر فلسفیوں نے انسانی ذات پر جو کام کیا ہے اس نے کچھ دریچے کھولے ہیں۔سری آروبندو نے ''حیات ربانی'' میں اور اوسپنسکی نے ''اعجاز کی تلاش'' میں انسان کے اندر بسنے والے جہانوں کی نشاندہی کی ہے۔ہمارے یہاں اقبالؒ نے مکانِ دروں کے نظریئے سے اس اقلیم کی جانب توجہ دلائی ہے جو عموماً سربستہ رہتی ہے۔

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تصوف کی صحیح

تعلیم یہی نہیں تھی کہ خدا کی آیات کو انفس میں تلاش کرنے کی راہ ڈھونڈی جائے اور کیا جب تک آفاق کے ساتھ ساتھ انفس میں خدا کی آیات کا وجود نہ نظر آئے یہ ممکن ہے کہ انسانی عمل کو وہ سرچشمہ نصیب ہو جائے جو دل میں خدا پر ایمان لانے ہی سے پھوٹتا ہے؟

آج ہم اضطراب، نامرادی اور سنگدلی کے جو مظاہر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کیا ان کی بناء یہ نہیں کہ ہم نے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کو اس کا جائز حق نہیں دیا خصوصاً جبکہ خدا کا حکم موجود ہے کہ گناہ کے ظاہر سے بھی بچو اور اس کے باطن سے بھی بچو؟ بے شک اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا اور تصوف کی مروجہ شکلیں رہبانیت بلکہ ویدانت کی گھسی پٹی صورتوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن کیا تصوف کا جوہر۔۔یعنی انفس میں خدا کی آیات کی تلاش۔۔ ہمارے لئے ان راہوں کو روشن نہیں کر سکتا جو انسان کو لپک کر خدا کا رفیق بن جانے کی رغبت دلاتی ہیں؟

پرویز: تصوف ایک اصطلاح ہے اور جب تک اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے اس کی تائید و تردید میں بات کرنا مفید نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ تصوف یا صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں، حتیٰ کہ اس زمانے کے دوسرے لٹریچر میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اب یہ دیکھئے کہ تصوف ہے کیا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی علم کے ذرائع تجربہ، مشاہدہ اور تفکر ہیں۔ ان سے بلند ایک اور ذریعۂ علم ہے اور وہ ہے وحی۔۔۔ جو انبیاء کو ملتی ہے۔۔۔ وحی میں نبی کے ذاتی فکر یا تجربے یا مشاہدے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نبی حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا، حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس میں معروضیت (Objectivity) بنیادی چیز ہے۔ وحی کا سلسلہ نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ لہٰذا علم کا یہ ذریعہ اس کے بعد بند ہو گیا۔ اب ہمارے لئے علم کے دو ہی چشمے ہیں۔ ایک قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق اور دوسرا ان کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر۔ اگر کوئی شخص آج حقیقت کا علم خدا سے براہ راست حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ دراصل نبوت کا مدعی ہے۔

تصوف کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ صوفی حقیقت کا براہ راست علم خدا سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سرخیل صوفیاء شیخ محی الدین ابن عربی کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حقیقت کا علم اس مقام سے حاصل کرتے ہیں جہاں سے نبی کو علم ملتا تھا۔ یہ تصوف کی وہ بنیاد ہے جو ختم نبوت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کا پتا نشان قرن اولیٰ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ تصور جو ایک بہت بڑی سازش کا پیش خیمہ تھا مسلمانوں میں بہت بعد میں لایا گیا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے''۔

اب آیئے انفس و آفاق والی آیت کی طرف۔ اس کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ قرآن جس انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے اسلام کی اولیں مخاطب قوم اس کو خود اپنے اندر بھی دیکھے گی اور دیگر اقوام عالم کے اندر بھی۔ لیکن انسان کی مضمر قوتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان پر غور و فکر کرنے کے لئے قرآن کریم نے کئی مقامات پر تاکید کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ داخلی مضمر قوتیں کیا ہیں۔ اس کے متعلق کسی مضمر پیچیدگی میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ انفرادی اور جماعتی طور پر ہم ہر روز ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کے لئے علم کی قوت، بے پناہ ہمتوں اور قربانیوں کے لئے یقین محکم (ایمان) کی قوت، نظم و ضبط کے تابع کام کرنے والے افراد کی مجموعی قوت، زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے صحیح عمل کی قوت، وغیرہ وغیرہ۔ یہ قوتیں قوانین خداوندی پر عمل کرنے سے ابھرتی ہیں جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں اور جن کا محسوس مظاہرہ سب سے پہلے محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے اسوۂ حسنہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا نام کردار کی بلندی

اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ لیکن انسان کی بعض داخلی قوتوں کا ایک فنی پہلو بھی ہے۔ جس طرح ایک پہلوان خاص قسم کی کسرت اور ریاضت سے اپنی جسمانی قوت اتنی بڑھالیتا ہے کہ وہ عام انسان ہی دکھائی نہیں دیتا اسی طرح خاص مشقوں کے ذریعے سے انسانی قوت ارادی کو اس طرح بڑھایا جاسکتا ہے کہ اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ ہندوؤں کی سادھیوں، مغ بچوں کے آتشکدوں اور عیسائیوں کی خانقاہوں (وغیرہ) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس کی ایک منجھی ہوئی شکل آج ہمیں ہپناٹزم کی صورت میں ملتی ہے۔ انسان کی یہ قوت خالص فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بلاتفریق مذہب وملت ہر اس شخص کو حاصل ہوسکتی ہے جو اس قسم کی ریاضتیں اور مشقیں کرے۔ مگر تو ہم پرستی کی تاریکیوں میں اس کو ''روحانیت کی کرامات'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی کو تصوف کا کمال قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ ایک فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ دین قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے جس سے ایک فرد کے اندر حسین وجمیل کردار کی روشنی چمکتی ہے اور ان افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ مرتب ہوتا ہے وہ کاروانِ انسانیت کو اس منزل مقصود کی طرف لے جاتا ہے جو شرف وتکریم انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔

قرآن کریم نے نبی اکرم ﷺ کو سیرت وکردار کے بلند ترین مقام پر فائز بتایا ہے (انک لعلیٰ خلق عظیم اس پر شاہد ہے) صحابۂ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین کے بھی حسنِ سیرت و بلندیِ کردار ہی کا تذکرہ کیا ہے، ان کی کسی روحانی قوت کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جہاں قوموں کے عروج وزوال کے سلسلے میں یہ ابدی قانون بیان کیا ہے کہ

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ اپنے انفس میں تبدیلی نہیں کرتی۔ تو اس سے قوموں کی نفسیاتی تبدیلی مراد ہے۔ تصوف کی رو سے کوئی روحانی تبدیلی مقصود نہیں۔

تصوف تو قوم یا اجتماعی زندگی سے بحث ہی نہیں کرتا۔ قرآن کے لغت میں تصوف کے لئے رہبانیت کا لفظ آیا ہے جسے وہ ذہن انسانی کا خود تراشیدہ مسلک قرار دیتا ہے۔ تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی شقوں میں تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اسلامی کمیونزم اور غیر اسلامی کمیونزم کا تصور پیش کرے۔

حنیف: ہمارے یہاں یہ تصور ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیم صوفیاء کرام کی مرہون منت ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر انفرادیت پسند ہے اور اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھیں تو تصوف کا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر بہت گہرا ہے، بلکہ اہل تصوف نے آگے بڑھ کر معاشرے کو گلے سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے بعض مفکرین مثلاً غزالیؒ شیخ احمدؒ سرہندی، شاہ ولی اللہؒ اور بعض کے نزدیک اقبالؒ کا بلند پایہ مجتہدین ہوتے ہوئے بھی تصوف سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ کیا ان لوگوں کی مثال سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا مقام اتصال بھی اسلام کی تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے نکل سکتا ہے جہاں شریعت اور تصوف باہم شیر وشکر ہوجائیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان حضرات نے درحقیقت کس قسم کا اسلام پھیلایا تھا لیکن جس اسلام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے وہ وہی اسلام تو ہے جس کا رونا میں اور آپ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس اسلام کا بہت گہرا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر ہوا ہے اور اسی اثر کو زائل کرنے کے لئے اس قدر کاہش وکاوش کرنی پڑ رہی ہے لیکن وہ پھر بھی زائل نہیں ہو رہا۔

باقی رہی شخصیتیں۔ تو قرآن کریم نے اس باب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ:

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم

ما کسبتم۔ ولا تسئلون عما کانوا یعملون۔

''یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں گزر گئے' جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ اور ہم تم سے یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔''

لہٰذا میرے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ متقدمین ہوں یا متاخرین' ان میں سے کسی کے جو اقوال و اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں گے انہیں ہم قابل ستائش سمجھیں گے۔ جو اس کے خلاف جائیں گے انہیں ہم مسترد کر دیں گے کہ ہمارے لئے کسوٹی خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا فکر و عمل۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

غلام احمد پرویز

بٹالہ/ لاہور

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش ۹/ جولائی ۱۹۰۳ء ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور ۱۹۵۵ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائیء اقبالؒ ہونے کے ناطے آپ ۱۹۳۰ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

۱۹۳۷ء کے موسم گرما میں، علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیامِ شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری اقدامات کئے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دور جدید کا اجراء مئی ۱۹۳۸ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دوقومی نظریہ'' اسلامی مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔ اس دوران کانگرسی اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا، اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے، اس لئے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لئے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے، مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزمِ اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیام پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب ۱۹۴۶ء میں سرخ پوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں، پاکستان میں شمولیت/ عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے

گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی کانگرسی وزارت اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز ۳۸۔۱۹۳۷ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمتہ کے تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظمؒ سے پیشگی وقت لئے بغیر ان کی خدمت میں، کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آجانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا۔ پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی، پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اسکا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لئے مناسب افسروں کے انتخاب کے لئے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مرد مجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپرد قلم کئے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو وفات پائی۔

(بشکریہ تحریک پاکستان گولڈ میڈل ۱۹۸۹ء، شعبہ تحریک پاکستان، محکمہ اطلاعات وثقافت، حکومت پنجاب)۔

نظریۂ خیر

ادارہ طلوع اسلام کے چیئرمین ڈاکٹر انعام الحق صاحب کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان ''نظریۂ خیر، فلسفۂ اخلاق اور قرآن کی روشنی میں'' شائع ہوگیا ہے۔ یہ فکر انگیز تصنیف ادارہ طلوع اسلام 25 بی، گلبرگ 2، لاہور سے دستیاب ہے۔ 534 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/300 روپے ہے۔ 50 فی صد کی خصوصی رعایت کے بعد صرف -/150 روپے میں علاوہ ڈاک خرچ

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

مجلّہ طلوع اسلام کی درج ذیل خوبصورت جلدیں 275 روپے فی جلد علاوہ ڈاک خرچ دستیاب ہیں۔

70, 72, 73, 75, 76, 77, 83, 84, 85, 86, 87, 88, 91, 94, 98, 2000, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009, 2010

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(یکے از مطبوعات ادارہ باغبان ایسوسی ایشن)

سبز انقلاب

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے۔

☆ باغبانوں کے غیر رسمی اجتماعات ہر ماہ کی 15-30 تاریخ کو ہوتے ہیں۔ جن میں باغبان اپنے تجربات، مشاہدات اور دیگر نظری معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی خاص، منفرد قسم کی بات یا دوسروں تک پہنچانے کی ضروری معلوماتی چیز ہو تو اسے نوٹ کر کے باغبان ایسوسی ایشن کے مرکز تک بھی پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح وہ نکتہ ریکارڈ پر آ جاتا ہے۔

☆ باغبان ایسوسی ایشن کی ممبرشپ پوری دنیا میں سب سے آسان ہے۔ سالانہ چندہ صرف دو روپے اور کوئی سے 10 عدد پھلدار پودہ جات کی فہرست اور اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو سٹیٹ دے کر ممبرشپ حاصل کی جا سکتی ہے۔ تاحیات ممبرشپ کے لئے -/100 روپے یک مشت ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس کی رسید جاری کی جاتی ہے۔

﴿مری میں باغبانی کے 100 سال﴾

مری میں باغبانی 14-1913ء سے شروع ہوئی تھی۔ جب بیرونی پودہ جات مری میں لگانے کی ابتدا ہوئی۔ اس سے پہلے صرف مقامی پھلدار پودہ جات تھے۔ باغبانوں سے التماس ہے کہ وہ چند معلومات میں تعاون فرمائیں۔ 100 سال کی عمر کے پرانے بزرگوں سے پوچھ کر بتائیں کہ مری میں کس نے؟ کب؟ اور کیا کچھ باغبانی کے لئے کیا۔

☆ آیئے ہفتۂ شجرکاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور سبز انقلاب کے لئے کام کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیو مری۔

(2) صبینہ یاسمین، سینئر نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں، سوہاوہ، جہلم۔

(3) تنویر صادق، نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، مکان نمبر 6/18، گلی نمبر 1، میاں چنوں، خانیوال۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی

حق تو یہ ہے عصرِ حاضر، عصر ہے پرویز کا

پرستش میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے اور خوئے پرستش ترک کرنے کے لئے بڑا حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونبیوں نے مل کر بنی اسرائیل کی تربیت کی اور انہیں فرعون کے چنگل سے باہر نکال لائے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی صرف چندروز کی غیر حاضری میں ساری قوم سامری کے جال میں پھنس گئی اور بچھڑے کی پرستش کرنی شروع کردی۔ اس میں سامری کا کمال کم تھا۔ اس میں انسان کی خوئے پرستش نے زیادہ کردار ادا کیا تھا۔ پرستش کا دارومدار مذہب پر، اور مذہب کا دارومدار پرستش پر ہوتا ہے۔ مذہب یا پرستش کی اگلی اور شاید آخری شکل تصوف ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ایک مرتبہ اس کوچہ میں داخل ہوگیا، اس کا اس سے باہر نکلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہماری ساری مسلمان قوم ایک ہزار سال سے تصوف میں ڈوبی ہوئی چلی آرہی ہے۔ پرستش، مذہب اور تصوف، تینوں ایک ہی چیز ہیں اور تینوں کا کوئی تعلق اس دنیا سے نہیں ہوتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں اس بات کا دعویٰ ہی نہیں کرتیں کہ ان میں سے کوئی چیز انسانیت کے مسائل حل کرسکتی ہے، یہ مسائل حیات کو نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں بلکہ ان کی طرف توجہ کرنا اور ان کو اہمیت دینا بھی غیر مناسب سمجھتی ہیں۔ پرستش کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہوسکتی۔ اس کی بے شمار شاخیں ہیں جن کا احصاء کرنا مشکل ہے۔ پہلے معاشرہ میں طبقات پیدا کرنا، اور پھر غریب طبقہ میں خیرات تقسیم کرنا، رمضان میں روزہ افطار کرانا، مساجد کی تعمیر میں چندے دینا اور ان کی تعمیر میں مدد دینا (9:19)- مزارات پر حاضری دینا، عبادت کے وہ سارے Modes جن میں اسلامی حکومت کی اطاعت شامل نہیں ہوتی، وہ پرستش ہے۔

واضح رہے کہ مذہب اور پرستش کی بنیاد روح اور انفرادی نجات کے غلط تصور پر قائم ہوتی ہے۔ مذہب میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پرستش کرنے سے روح انسانی کا تزکیہ ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی رو سے روحِ انسانی کا تصور ہی غلط ہے۔ قرآن کریم میں روح خداوندی کا ذکر تو ملتا ہے، لیکن روحِ انسانی کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ جب قرآن میں روحِ انسانی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، تو روحانیت کا تصور بھی غلط ہے اور روحانیت سے متعلق تمام عقائد، رسوم، پرستش، تصوف کی پوری عمارت، یہ تمام چیزیں بے بنیاد قرار پا جاتے ہیں۔ روح کے برخلاف قرآن کریم نے نفس انسانی کا تصور دیا ہے اور اس کی نشوونما کو ہی مقصد حیات قرار دیا ہے، لیکن اس کی نشوونما کے لئے پرستش کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، نفس انسانی کی نشوونما قرآنی مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ جو صرف اسلامی نظام میں ہی ہوسکتی ہے۔ نفس انسانی کی نشوونما کے لئے ہی اسلامی نظام کا قائم

کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مذہب کے برخلاف دین مسائل حیات حل کرتا ہے۔ دین کی اصل ہی یہ ہے کہ قانون خداوندی کے مطابق فیصلے کرنے سے انسانیت کے مسائل حل ہوتے ہیں: ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلاً (4:59)- قانون خداوندی سے مسائل حل کرنے کا طریقہ بہترین طریقہ ہے اور یہ انجام کار معاشرہ کا توازن قائم رکھنے کا موجب ہوتا ہے۔ دین کی کسوٹی اور اس کی میزان یہ ہے کہ: قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَکُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135)- ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ' میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں اور اس کے بعد نتائج خود بہت جلد بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کو نصیب ہوتی ہے اور ظلم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ یعنی دین میں نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَیٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ کَاذِبٌ وَارْتَقِبُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ رَقِیْبٌ (11:93)- میری قوم تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے چلا جاتا ہوں۔ نتائج بہت جلد بتا دیں گے کہ کس پر رسوا کن تباہی کا عذاب آتا ہے اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ یہ تحدی اور چیلنج صرف دین ہی کر سکتا ہے۔ دین کا وجود خارج میں ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (9:105)- تم عمل کرتے جاؤ' اللہ اور اس کا رسول (اسلامی حکومت کا مرکز) اور مومنین (اس نظام کے ارکان) تمہارے اعمال کی نگرانی کریں گے۔ یہ ہے وہ دین جس کی نگرانی خود رسول کرتا ہے یا اس کے بعد اس نظام کا مرکز کرتا رہتا ہے۔ جو وعدے اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے کئے ہوئے ہیں۔ وہ اقامتِ دین کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کے مسائل حل کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ہی دعائیں پوری ہوتی ہیں۔ دین اور صرف دین ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے توسط سے انسانیت کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم رہتا ہے۔ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے واسطہ سے اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر دین قائم نہ ہو' جس طرح کہ آج کل نہیں ہے تو اللہ و رسول کی اطاعت کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی۔

آپ اس بات پر توجہ فرمائیں کہ ہم مسلمانوں پر پرستش کا اس قدر غلبہ ہے کہ جو چند جماعتیں اقامتِ دین کی داعی ہیں وہ بھی ''پرستش'' کو ترک کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں جماعتِ اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مرحوم کی تنظیم اسلامی' دونوں اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہیں لیکن انہوں نے بھی پرستش کو ترک نہیں کیا۔ ایران میں وہاں کے علماء نے اپنے تصور کے مطابق حکومت بھی قائم کر لی' لیکن انہوں نے بھی پرستش کی رسوم کو جاری رکھا۔

صدر اول کے بعد سے ہم مسلمان اسی تاریکی میں ڈوبے چلے آرہے تھے اور پرستش کی وجہ سے قعرِ مذلت میں پڑے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت بے پایاں' اور رحمتِ کاملہ سے' جناب پرویز صاحب مرحوم نے تحریک طلوع اسلام کی طرح ڈالی یہ تحریک خالص قرآنی عقائد و نظریات کی داعی تھی اور قرآنِ کریم کے خلاف جس قدر عقائد مسلمانوں میں در آئے تھے' اس تحریک نے ان عقائد کو قرآن کی روشنی میں پرکھا اور جو عقیدہ قرآن کے خلاف نظر آیا' اس کو جھٹک کے

الگ کر دیا۔ قرآن کریم اور خود تحریک طلوع اسلام شخصیت پرستی کے خلاف ہے' اس لئے پرویز صاحب نے قرآن کی جو خدمت کی ہے' ان کی جگہ تحریک طلوع اسلام کا نام تحریر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ تحریک طلوع اسلام اور پرویز صاحب ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ اس مضمون میں جو Credit تحریک طلوع اسلام کو دیا گیا ہے وہ سب پرویز صاحب کی ذات عالی صفات کے متعلق ہے۔

''پرستش'' اور مذہب کے غلبہ کے اس پس منظر میں جو آپ کے سامنے پیش خدمت کیا گیا ہے تحریک طلوع اسلام کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد سے یہ پہلی تحریک ہے جو اقامتِ دین کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ جب نبوت جاری تھی اس دور میں نوح علیہ السلام سے لے کر حضورﷺ تک اقامتِ دین کے داعی صرف انبیاء کرام ہوتے تھے۔ حضورﷺ پر نبوت ختم ہوگئی۔ اس لئے دین قائم کرنا اور اس نظام کو جاری رکھنا خود مسلمانوں کی ذمہ داری تھی لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے ذہن سے وہ تصور ہی جاتا رہا۔ اس وضاحت سے تحریک طلوع اسلام کی اہمیت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں اور یہ اندازہ بھی آپ کو ہوگا کہ کس درجہ خوش قسمت ہیں جو اس تحریک سے وابستہ ہیں اور اس طرح آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس بخوبی ہوگا۔

اس تحریک کا Corner-Stone ہی یہ ہے کہ انسان کی حکومت انسان پر قطعاً حرام ہے' نزول قرآن کے وقت انسانیت بالغ ہو چکی تھی اس لئے قرآن کریم نے شخصی حکومت کو بالکل منع کر دیا۔ انسانیت کے بالغ ہونے کی یہ تین علامات ہیں۔ پہلی علامت تو یہ ہے کہ اس دور کی انسانیت نے اس ضابطۂ حیات کے مطابق اپنا نظام تشکیل کر لیا۔ دوسری علامت یہ ہے کہ انسانیت وحی کے اصولوں کی جزئیات مقرر کرنے کی اہل ہو گئی تھی۔ اور انسانیت کے بلوغ کی تیسری علامت ختم نبوت ہے۔ انسانیت کے بلوغ کی وجہ سے قرآن کریم نے شخصی حکومت کے بجائے نظام کا تصور روشناس کرایا۔ اسلامی نظام کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دے دیا گیا۔ یہ ہمارے علمائے کرام کا تسامح ہے کہ وہ اللہ و رسول کی اطاعت کو دو اطاعتیں قرار دے کر' حضورﷺ کے بعد حضورﷺ کی ذاتی اطاعت کا ذریعہ احادیث کی اطاعت کو قرار دیتے ہیں اور اس طرح اسلامی نظام کا تصور ہی اوجھل ہو گیا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ حضورﷺ کے دور اقدس میں اسلامی مملکت دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی' اتنی بڑی حکومت کا انتظام حضورﷺ خود کرتے تھے۔ حضورﷺ نے جگہ جگہ شہر بشہر اپنے مقامی اولی الامر (4:83) اور مقامی حکام مقرر کئے ہوئے تھے (2:188) جو لوگ مدینہ شریف سے دور افتادہ مقامات پر رہائش پذیر تھے وہ اپنے تنازعات طے کرانے کے لئے دور دراز سے مدینہ شریف حاضر نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے مقامی اولی الامر یا مقامی حکام کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان مقامی حکام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہو جاتی تھی' کیونکہ اصل مقصود اس نظام کی اطاعت تھی۔ ہم بھی جب چوراہے پر کھڑے ہوئے سپاہی کی اطاعت کرتے ہیں' تو یہ اس کی ذاتی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس نظام کی اطاعت ہوتی ہے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے۔ یہ تحریک طلوع اسلام کا منفرد نظریہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ آج بھی اگر ہم اسلامی نظام قائم کر کے' اس کی اطاعت کریں گے تو یہ اللہ و رسول کی ہی اطاعت ہوگی۔ اس طرح ''پرستش'' کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

قرآن کریم نے الصلوٰۃ قائم کرنے کا حکم دیا۔ قرآن

کریم کی رو سے عبادات اور معاملات الگ الگ نہیں ہوتے۔ قرآن کی رو سے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن کریم میں حکم ہے کہ جب کسی کو قرض دو تو اس کو لکھ لیا کرو جب ہم کسی کو قرض دیتے ہوئے لکھ لیتے ہیں اس طرح ہم عبادت الٰہی کرتے ہیں۔ قرآن کی رو سے اقامتِ صلوٰۃ اور اقامت دین ایک ہی چیز ہے کیونکہ

(1) قرآن کریم نے الصلوٰۃ اور الدین دونوں کے لئے اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے اور دونوں چیزوں پر عمل ان کی اقامت سے ہوتا ہے، پرستش سے نہیں ہوتا۔

(2) سابقہ تمام انبیاء کرام کو اقامت دین اور اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا تھا جو دونوں ایک ہی چیز تھیں تمام انبیاء کرام نے دین اور صلوٰۃ قائم کی تھی: شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ (42:13)- تمہارے لئے دین کا راستہ مقرر کیا گیا، اسی طرح صلوٰۃ کے لئے بھی حکم تھا۔ يَا بُنَيَّ اَقِمِ الصَّلَاةَ (31:17, 19:55)-

(3) دین میں فرقہ بندی نہیں ہوسکتی: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيْهِ (42:13)- دین قائم کرو اور اس میں فرقے نہ بناؤ۔ اسی طرح صلوٰۃ کے بارے میں ارشاد ہوا: وَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُوْنُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ o مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ (30:31)- اور نماز پڑھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے بنائے۔

(4) ایک آیت تو اس بارے میں کہ اقامت صلوٰۃ اور اقامت دین ایک ہی چیز ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (98:5)- نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو تو یہی سچا دین ہے۔ ایک جگہ قرآن نے صلوٰۃ الوسطیٰ کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ فرمایا: حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (2:238)- اسلامی حکومت کے تمام اداروں کی حفاظت کرو اور خاص طور پر مرکزی حکومت Central Govt. کی حفاظت کرو اور اس کی وضاحت وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ سے کر دی۔ احکام خداوندی کو لے کر کھڑے ہو جاؤ اور اس پر استقامت رکھو۔ اقامت صلوٰۃ میں کسی جگہ پرستش کا تاثر نہیں ملتا۔ یہ جو ہماری پانچ وقت کی نمازیں ہیں یہ بھی اس نظام کا اہم حصہ ہیں۔

احکاماتِ الٰہیہ نافذ کرنے سے پیشتر ہم سجدہ ریز ہو کر اور رکوع میں جا کر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ ہم اس نظام کے فرمانبردار ہیں اور دل سے اس کی فرمانبرداری کرنے کے لئے کمربستہ ہیں۔

قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ اور انسانیت کا رابطہ نبوت کے ذریعہ ہی ہوسکتا تھا، جب حضور ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے رابطہ قرآنِ کریم یا قرآن کے نظام کی معرفت ہی قائم ہوسکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے قرآن کریم کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے وحی خفی، الہام، القا، کشف، استخارہ، تفاول، ضمیر، خواب، وجدان کے دروازے کھول دیئے جس سے یہ مراد تھی کہ قرآن کے علاوہ ان ذرائع سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ تحریک طلوع اسلام وہ واحد تحریک ہے جو قرآن کریم کو اس کے اصل مقام پر رکھتی ہے اور قرآن کے علاوہ کسی ذریعہ کو بھی درست قرار نہیں دیتی۔

قرآنِ کریم نے خود ہی قرآن فہمی کے لئے دو اصول مقرر کر دیئے ہیں جنہیں قرآن فہمی کے لئے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اصول تو محاورۂ عرب ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اسی طرز

تکلم میں نازل ہوا ہے جس میں عرب خود کلام کرتے تھے۔ ''بلاشبہ قرآن حق ہے۔ اور اس کا انداز بیان وہی ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو'' قرآن فہمی کا دوسرا اصول جس کی خود قرآن کریم نے نشاندہی کی ہے وہ تصریف آیات ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (6:65)- آپ غور فرمائیں ہم کس طرح مختلف پہلوؤں سے دلائل پیش کرتے ہیں شاید کہ وہ سمجھ جائیں۔ نیز قرآن کے بیان کے مطابق خود حضورﷺ کا طریقہ قرآن فہمی بھی یہی تھا: وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ وَلِيَقُولُواْ دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (6:105)- اے رسول ہم اسی طرح اپنی آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیں) اور تاکہ یہ لوگ کہنے لگ جائیں کہ آپ نے قرآن خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری وجہ یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیات کی خود ہی تبیین کر دیں۔

ان بیان کردہ دو اصولوں کے علیٰ الرغم ہمارے مفسرین کرام نے قرآن کی تفسیر میں زیادہ زور شان نزول اور روایات پر دیا ہے لیکن شان نزول کا نظریہ بالبداہت درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔ شان نزول کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو اس متعلقہ واقعہ کے بارے میں آیۂ کریمہ نازل ہو جاتی تھی' اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس کی مثالیں پیش خدمتِ عالی کی جائیں۔ لیکن یہ بات بادی النظر میں ہی غلط معلوم ہوتی ہے' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آیات کا نزول پیش آمدہ واقعات کے ساتھ وابستہ تھا اگر وہ واقعہ پیش نہ آتا تو وہ آیت نازل نہ ہوتی۔ اس کے برخلاف اگر واقعات زیادہ پیش آجاتے تو آیات بھی زیادہ تعداد میں نازل ہوتیں۔ اصل یہ ہے قرآن کریم کا نزول اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق ہوا ہے اور اس میں وہ تمام ہدایات نازل کر دی گئی ہیں جو قیامت تک کے لئے انسانوں کے تقاضوں کو پورا کر دیتی ہیں۔ ہمارے مفسرین کرام آیت تو قرآن سے لے لیتے ہیں پھر اس آیت کی شان نزول کتب روایات میں ڈھونڈھتے ہیں۔ ایک ایک آیت کی کئی کئی شان نزول ہیں اور یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کون سا شان نزول درست ہے اور کونسا غلط ہے۔ اس طرح قرآن کریم جو بالکل حق ہے اس کی تفسیر ہمارے مفسرین کرام ضعیف و وضعی احادیث سے کر کے' اس تفسیر کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مفسرین کرام اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ تفسیر کرنے میں سابقہ تفاسیر سے سرمو انحراف نہ کریں اور ''سلف صالحین'' نے جو تفسیر کی ہے اس کو من وعن تسلیم کر لیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہماری موجودہ دور کی تفاسیر' خواہ وہ عراقی و مصری ہوں' یا ہمارے برصغیر میں تحریر کی گئی ہوں' وہ ''سلف صالحین'' کی سابقہ تفاسیر سے بدرجہا بہتر ہیں' آپ تفسیر طبری اور ابن کثیر کا موازنہ تدبر قرآن' اور تفسیر ''تفہیم القرآن'' سے کریں۔ موجودہ دور کی یہ تفاسیر بھی اگرچہ غیر قرآنی اصولوں کے ماتحت تحریر کی گئی ہیں لیکن سلف صالحین کی سابقہ تفاسیر سے یہ تفاسیر بہت بہتر ہیں۔ تحریک طلوع اسلام کا پیش کردہ مفہوم القرآن دینی نقطۂ نگاہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں تفسیر و تفہیم کے وہ اصول پیش نظر رکھے گئے ہیں جو خود قرآن کریم نے متعین فرمائے ہیں۔ اس مفہوم میں قرآن کے الفاظ کے وہ معانی لئے گئے ہیں جو نزول قرآن کے وقت متداول تھے اور چونکہ آیات کی تفسیر آیات سے کی گئی ہے' اور تفسیر کرنے میں کوئی خارجی سہارا نہیں لیا گیا ہے اس لئے اس تفسیر میں خارجی نظریات داخل نہیں ہو سکے ہیں۔ اس میں صرف قرآن کریم کے نظریات ہی پیش کئے گئے ہیں۔ اس تفسیر کی آیات خود بول کر اپنا مفہوم بیان کر

دیتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اب تک جس قدر بھی تفاسیر تحریر کی گئی ہیں وہ سب مذہبی نقطہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہیں اور سب قرآن فہمی میں ایک رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ ان ہزاروں ہزار تفاسیر میں سے ایک تفسیر بھی ایسی نہیں ہے جو موجودہ ذہن کو مطمئن کر سکے۔ تحریک طلوع اسلام کی یہ تفسیر ''مفہوم القرآن'' عصر حاضر کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

جہاں تک قرآن کریم کی لغات کا تعلق ہے اس سارے طویل عرصہ میں صرف امام راغب کی مفردات ہی سب حضرات Consult کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کی اور کوئی معتمد علیہ لغت موجود نہیں تھی۔ تحریک طلوع اسلام نے قرآن فہمی کے لئے لغات القرآن پیش کی۔ اس لغت میں قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی تحریر کئے گئے ہیں جو معانی نزول قرآن کے وقت لئے جاتے تھے۔ یہ لغت 4 ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس لغت کو صرف وہ حضرات ہی Appreciate کر سکتے ہیں جن کو عربی ادب پر عبور حاصل ہو۔ ہمارے علماء کرام میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس ''مفردات'' اور ''کشاف'' موجود ہے تو اس شخص کو قرآن فہمی کے لئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن کشاف اس دور کے لئے قطعاً کافی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اس دور میں قرآن فہمی کے لئے جس شخص کے پاس ''لغات القرآن'' اور ''مفہوم القرآن'' موجود ہے، اسے مزید کسی کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تحریک طلوع اسلام کی پیش کردہ یہ دو کتابیں قرآن فہمی کے لئے کافی ہیں اور یہ موجودہ دور کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہیں اور یہ لغت اور تفسیر ایسا نظام زندگی پیش کرتی ہیں جو زندگی کے تمام تقاضے پورا کرتا ہے اور جس میں زمانہ کے ساتھ آگے چلنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ہماری تفاسیر چونکہ ملوکیت کے دور کی تحریر کردہ ہیں اس لئے ان میں سرمایہ داری اور ملکیت زمین کو حد درجہ سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملکیت زمین کا تصور اس دور کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں پاکستان میں تمام خرابیوں کا اصل سبب یہی جاگیرداری نظام ہے۔ قرآن کریم نے ملکیت زمین بالکل ناجائز قرار دی ہے کیونکہ زمین تو انسان کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھی۔ اس دور میں زمین کس کی ملکیت تھی۔ لیکن قرآن کریم نے یہ بات پہلے ہی بتا دی تھی کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ زمین کی ملکیت اور جاگیرداری نظام ختم ہوتا چلا جائے گا۔ ارشاد ہوا ہے: **اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا** (21:44, 13:41)- کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم کس طرح زمین کو بڑے بڑے جاگیرداروں (اطراف) کے ہاتھ سے چھین کر ان کی مقبوضات کو ختم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس موضوع پر تحریک نے بے شمار مضامین اور ایک پوری مبسوط کتاب ''نظام ربوبیت'' شائع کی ہے۔ جو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

قرآن کریم کی وہ آیات جو خواتین کے حقوق سے متعلق ہیں، ہمارے مفسرین کرام نے ان کی ایسی تفسیر کی جس سے خواتین کے حقوق بالکل پامال و تلف ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ ادوار میں تو یہ بات چل سکتی تھی جبکہ خواتین کی بڑی تعداد ناخواندہ تھی، اور ان کی نگہداشت مردوں کے ذمہ تھی، لیکن عصرِ حاضر میں جب خواتین نے بھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کر لی ہے تو انہیں ابھی اپنے حقوق کے حصول کا احساس ہو گیا ہے۔ قرآنِ کریم نے خواتین کے اس درجہ حقوق دیئے ہیں کہ اگر ان حقوق کو ہی واضح کر دیا جائے تو خواتین بالکل مطمئن ہو سکتی ہیں۔ اس تحریک نے خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں خاص طور پر توجہ دی ہے۔ اس بارے میں بے شمار مضامین رسالہ طلوع اسلام میں شائع

ہوئے اور ایک الگ کتاب ''طاہرہ کے نام'' بھی تحریر کی گئی۔ یہ کتاب اس درجہ مقبول ہوئی ہے کہ یہ خواتین کے حقوق حاصل کرنے کے تمام N.G.Os اور عورت فاؤنڈیشن میں موجود ہوتی ہے۔ آج کل تمام وکلاء اور دانشور اس کتاب سے کماحقہ استفادہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب عصر حاضر کی ایک ایسی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر خواتین کو قرآن کریم پر شبہ کرنے کا موقع ملتا رہتا۔

اس دور میں روس کے زوال سے پیشتر کمیونزم نے بھی بڑی اہمیت حاصل کی ہوئی تھی۔ اصل تو یہ ہے کہ اسلام کی ابتداء کے بعد سے آج تک انسانی ذہن کوئی ضابطۂ حیات بنا ہی نہیں سکا تھا۔ جس کو اسلام کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے' کمیونزم کا فلسفہ اور اس کی آئیڈیالوجی پہلی آئیڈیالوجی ہے جو اسلام کے مقابلہ پر آ سکتی تھی۔ اس کی تردید کرنا ہماری پیشوائیت کے بس کی بات نہیں تھی۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

تحریک طلوع اسلام نے کمیونسٹ آئیڈیالوجی کا علمی سطح پر مقابلہ کیا۔ روسی اور چینی دونوں نظریات پر الگ الگ تبصرہ کیا۔ یورپ اور امریکہ جو کمیونزم کے سخت مخالف ہیں ان کے ہاں بھی کمیونزم کی تردید میں اس قدر مضبوط لٹریچر تحریر نہیں کیا گیا جس قدر مضبوط اور عالمانہ لٹریچر اس تحریک نے مہیا کیا ہے۔ آپ اس بات سے اندازہ فرمالیں کہ ہماری پیشوائیت ان مضامین کے Contents تک سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ اسی وجہ سے پیشوائیت کے کسی حلقہ کی طرف سے ان مضامین پر کوئی تبصرہ یا ان مضامین کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کی اس قدر مذمت کی ہے کہ اسے شرک (30:31) کے مرادف قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ اللہ تعالیٰ سے رہتا ہے اور نہ رسول سے (6:159) اس کی وجہ سے دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی رسوائی ملتی ہے۔ لیکن یہ ایک حیرت کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں میں فرقہ بندی ایک ہزار سال سے چلی آ رہی ہے اور اس کو مسلمان تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر مزید حیرت یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی اس قدر واضح آیات کے باوجود ہماری پیشوائیت بھی اس کو تسلیم کرتی چلی آ رہی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اور ہماری پیشوائیت اس کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاتی۔ بلکہ ہر عالم خود کو کسی نہ کسی فرقہ کے ساتھ منسلک کر لیتا ہے۔ وہ صرف اس بات کے خلاف ہیں کہ فرقے آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہ کریں۔ اور ملک میں فساد برپا نہ ہو' اگر مختلف فرقے آپس میں رواداری اور تعاون کے ساتھ زندگی بسر کر لیں تو ہماری پیشوائیت کو فرقہ بندی سے کوئی تعرض نہیں ہوتا۔ اتحاد بین المسلمین کے معنے ہی یہ ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد رکھیں لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے فرقہ بندی ہی منع ہے خواہ وہ آپس میں کتنی محبت اور الفت سے کیوں نہ رہیں۔ ہماری حکومتیں سارے سال اور خصوصاً محرم سے پیشتر خصوصی طور پر علماء کرام سے امن وامان قائم کرنے کے لئے اپیل کرتی ہیں اور فرقہ بندی کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ جب فرقے علماء نے خود ہی بنائے ہیں' تو یہ فرقہ بندی کو کیسے ختم کر سکتے ہیں۔ فرقہ بندی میں تو ان نظریات وعقائد کو اور زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے جو باہم مختلف فیہ اور متنازع فیہ ہوتے ہیں۔ اگر ان امتیازی خطوط کو نظر انداز کر دیں تو پھر فرقہ کا کمزور ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

اس دور میں ہر وہ نظریہ جو ''مذہب'' پیش کرتا ہے' عصرِ

حاضر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ عصر حاضر میں صرف دین کے نظریے قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ تحریک طلوع اسلام نے کوشش کی ہے کہ قرآن جس نظام کو انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے پیش کرتا ہے' اسے عصر حاضر کی انسانیت کے سامنے پیش کر دے اس امید کے ساتھ کہ آج کی دکھی انسانیت علیٰ وجہ البصیرت اور تاریخی شواہد کی روشنی میں اس ضابطۂ حیات پر غور کرے۔ اگر عصر حاضر کے مفکرین اس نتیجہ پر پہنچیں کہ واقعاً اس ضابطۂ حیات میں انسانیت کے مسائل کا حل موجود ہے' تو اس پر عملاً تجربہ کریں' اس لئے کہ کسی بھی ضابطۂ حیات کے نتائج جب ہی سامنے آسکتے ہیں جب اس پر عملاً تجربہ کیا جائے قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے پیش کردہ نظام کو عملاً آزما کر دیکھ لو' اس کے نتائج اس دعویٰ کی صداقت کی دلیل بن جائیں گے۔

تحریک طلوع اسلام نے جس قدر بھی نظریات پیش کئے وہ سب اس دور کے مصائب و نوائب کو حل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسلام کا نظام قیام قیامت تک جاری رہے گا اور میری رائے میں اس کی صرف وہ تعبیر قابل عمل ہوگی جو طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی گئی ہے اور وہاں سے ہی پیش کی جائے گی' کیونکہ یہ دور صرف اسی تحریک کا دور ہے۔

کھاتہ داران حضرات

﴿خصوصی توجہ فرمائیں﴾

جن کھاتہ داران نے اپنے اپنے کھاتوں سے مجلّہ طلوع اسلام جاری کروایا ہوا ہے ان سے گذارش ہے کہ آپ اپنی فہرست خریداران ادارہ طلوع اسلام کو بھجوا دیں اور جن کو میگزین سال 2011ء کے لئے جاری رکھنا مقصود ہو یا جن کے میگزین بند کرنے ہوں' مکمل فہرست' ایڈریس کے ساتھ بھجوا دیں تا کہ بروقت عمل درآمد ہو سکے۔ شمارہ کی اشاعت میں اضافہ آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ پاکستان میں یونیورسٹیز' کالجز کی لائبریریوں کو لندن بزم و ناروے بزم کے تعاون سے 100/100 میگزین بھیجے جا رہے ہیں جو کہ بہت کم تعداد ہے۔ اگر بیرون ملک یا اندرون ملک کی بزمیں مزید تعاون کریں تو اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے اور پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں میگزین بھیجنا ممکن ہو سکے گا۔ امید ہے کہ بزمیں اس مسئلہ پر تعاون کریں گی۔

کھاتہ داران جن کے ذمے طلوع اسلام کی رقم بقایا ہے ان کو ان کے کھاتوں کی تفصیل بھجوائی جا رہی ہے تاہم اگر کسی وجہ سے یہ ان تک نہ بھی پہنچے تو بھی تمام کھاتہ داران سے التماس ہے کہ وہ اپنے کھاتوں میں معقول رقم جمع کرانے کا اہتمام کریں تا کہ واجب الادا رقوم کی وجہ سے ادارہ مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔

بینک اکاؤنٹ کے لئے ضروری وضاحت

1- بینک کا اکاؤنٹ نمبر۔	3082-7
2- بینک کا نام۔	نیشنل بینک آف پاکستان' مین مارکیٹ برانچ گلبرگ' لاہور (پاکستان)۔
3- نام اکاؤنٹ۔	ادارہ طلوع اسلام

شکریہ

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام لاہور

پاکستان میں
غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل منظور شدہ مقامات پر ہوتا ہے

نوٹ: نمائندگان محترم سے التماس ہے کہ ایڈریس یا اوقاتِ درس میں تبدیلی کی صورت میں ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	KL-234 کیہال۔ رابطہ۔ گل بہار صاحبہ	بروز جمعہ	10AM
ایبٹ آباد	KL-234 کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین، فون۔ 0992-334699، موبائل 0321-9813250	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
اسلام آباد	برمکان ڈاکٹر انعام الحق، مکان نمبر 302، سٹریٹ نمبر 57، سیکٹر F-11/4	بروز اتوار	11AM
	رابطہ: ڈاکٹر انعام الحق، فون نمبر 051-2290900، موبائل: 0333-5489276		
اوکاڑہ	برمکان احمد علی، بیت الحمد، 180-AB-4، شادمان کالونی، ایم۔اے جناح روڈ،	بروز جمعہ	3PM
	رابطہ میاں احمد علی: 0442-527325، موبائل: 0321-7082673		
بچ کسی	برمطب حکیم احمد دین۔ رابطہ فون نمبر:	بروز جمعہ	3PM
جہلم	جنجوعہ ٹاؤن، پوسٹ آفس فوجی ملز، نزد بیکن ہاؤس سکول۔ رابطہ فون نمبر:	ہر ماہ پہلی اور آخری اتوار	4PM
چوٹی زیریں	بردوکان لغاری برادرز، زرعی سروس، ڈیرہ غازی خان۔ رابطہ: ارشاد احمد لغاری۔ موبائل: 0331-8601520	ہر ماہ پہلا اتوار	12 بجے دن
چنیوٹ	W-11/9، گوجر چوک (گنبد والی کوٹھی) سیٹلائیٹ ٹاؤن۔	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
	رابطہ: آفتاب عروج، فون: 047-6331440-6334433۔		
حیدرآباد (قاسم آباد)	محترم ایاز حسین انصاری، B-12، حیدرآباد ٹاؤن، فیز نمبر 2، قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
	آخری بس سٹاپ۔ رابطہ فون: 022-654906		
راولپنڈی	فرسٹ فلور، کمرہ نمبر 114، فیضان پلازہ۔ کمیٹی چوک۔	بروز جمعہ	4PM
	رابطہ ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ، موبائل: 0331-5035964	بروز اتوار	4PM
راولپنڈی	برمکان امجد محمود، مکان نمبر 14/A، گلی نمبر 4، راہِ طلوع اسلام، جنجوعہ ٹاؤن، اڈیالہ روڈ،	بروز اتوار	10AM
	نزد جراہی سٹاپ، راولپنڈی۔ رابطہ: رہائش: 051-5573299، موبائل: 0322-5081985		
خان پور	بمقام مکان حبیب الرحمان، محلہ نظام آباد، وارڈ نمبر 9 خان پور، ضلع رحیم یار خان	بروز جمعہ	3PM
	رابطہ: نمائندہ حبیب الرحمٰن۔ فون نمبر گھر: 068-5575696، دفتر: 068-5577839		

سیالکوٹ	معرفت کمپیوٹرسٹی، سٹی ہاؤس، سٹی سٹریٹ، شہاب پورہ روڈ، رابطہ: محمد حنیف 03007158446۔ محمد طاہر بٹ 0300-8611410۔ محمد آصف مغل 0333-8616286۔ سٹی ہاؤس 052-3256700	ہر دوسرے اتوار	5PM
سرگودھا	B-4، گلی نمبر 7، بلاک 21، نزد مکی مسجد چاندنی چوک، رابطہ۔ ملک محمد اقبال۔ فون: 048-711233	بروز منگل	7PM
فیصل آباد	رحمان نور سینٹر، فرسٹ فلور، مین ڈگلس پورہ بازار، رابطہ: محمد عقیل حیدر، موبائل: 0313-7645065	بروز جمعہ	4PM
فتح پور، سوات	فتح پور، سوات، رابطہ: خورشید انور، فون: 0946600277، موبائل: 0303-8621733	بروز اتوار	3PM
	محترم ظاہر شاہ خان آف علی گرام، سوات کا ڈیرہ۔ موبائل: 0346-9467559	ہر اتوار	9AM
کراچی	105 سی بریز پلازہ، شاہراہ فیصل۔ رابطہ شفیق خالد، فون نمبر: 0300-2487545	بروز اتوار	10AM
کراچی	A-446 کوہِ نور سنٹر، عبداللہ ہارون روڈ، رابطہ محمد اقبال۔ فون: 021-35892083، موبائل: 0300-2275702	بروز اتوار	10AM
کراچی	ڈبل اسٹوری نمبر 16، گلشن مارکیٹ، کورنگی نمبر 5۔ رابطہ: محمد سرور۔ فون نمبرز: 021-35031379-35046409، موبائل: 0321-2272149	بروز اتوار	2PM
کراچی	نالج اینڈ ویز ڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر C-15، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی۔ رابطہ: آصف جلیل فون نمبر: 021-35421511، موبائل: 0333-2121992، محمود الحسن۔ فون: 021-35407331	بروز اتوار	11AM
کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ۔ رابطہ فون: 081-2825736	بروز اتوار	4PM
گوجرانوالہ	شوکت نرسری، گل روڈ، سول لائنز۔ رابطہ: موبائل: 0345-6507011	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
لاہور	B-25، گلبرگ 2، (نزد مین مارکیٹ، مسجد روڈ)۔ رابطہ فون نمبر: 042-35714546	بروز اتوار	10AM
لاڑکانہ	بر مکان اللہ بخش شیخ نزد قاسمیہ محلہ جاڑل شاہ، رابطہ فون: 074-4042714	بروز جمعہ	بعد نماز مغرب
منڈی۔۔ بہاؤالدین	رابطہ: خان محمد، (وڈیو کیسٹ) بر مکان ماسٹر خان محمد گلی نمبر 1، محلہ صوفی پورہ۔ فون نمبر: 0456-502878	بروز جمعہ	10 AM
نواں کلی، صوابی	رابطہ بابو اسرار اللہ خان، معرفت ہومیو ڈاکٹر ایم۔ فاروق، محلہ خدر خیل۔ فون نمبر:	بروز اتوار	10 AM
صوابی	بمقام چار باغ، (حجرہ ریاض الامین صاحب)، (رابطہ: انچارج یوٹیلیٹی سٹورز، مردان روڈ، صوابی) فون نمبرز: (0938)310262, 250102, 250092	بروز اتوار	3 P.M

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خریدار حضرات خصوصی توجہ فرمائیں

جن خریدار حضرات کی زرِ شرکت ماہنامہ طلوع اسلام ختم ہو چکی ہے وہ برائے مہربانی جلد از جلد ادارہ کو ارسال فرمائیں۔ شکریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویزؒ صاحب کی ایک تحریر

یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) ''نوکر شاہی'' آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلوب پر کم غور کیا ہوگا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ اس مشین کا آپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلقہ ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے۔ اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسانوں سے ہوتا ہے، مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (Materialism) سے جب تصورِ حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کر لیا گیا۔ اسے کہتے ہی (Mechanical Concept of Life) ہیں۔ اس سے انسانوں کے (Human Beings) ہونے کا تصور ختم ہو گیا اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم و نسق کے لئے بھی کچھ قواعد و ضوابط منضبط کئے اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد و ضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (Case) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کر دیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظام حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظام حکومت میں سب سے زیادہ قابل۔ دیانت دار۔ ذمہ دار۔ معتمد علیہ افسر اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر، انکے معاملات کا متعلقہ قواعد و ضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بھی اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر دیا، اور افسران بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی

ہے، نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد وضوابط کی رو سے (میکانکی طور پر) کر دیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے ''انسانیت'' پر کیا گذری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار لگے، درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطراب پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد وضوابط کے مطابق، دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (Human-consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا..... وہاں ترجیح ''فارمز کے پر کرنے'' کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب واضطراب اور عدم سکون واطمینان ہوتا ہے۔

☆☆☆

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ انداز عمل، ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو، ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیّات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان کے گھر کی زندگی بھی ''بابو آنہ'' بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:

(Un-Touched by Hand During Manufacture)

ان کے بنانے میں ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل (Robots) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں۔ (۱) جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو، تو دوسرے انسانوں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں لوچ کیسے آسکے گی۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ

بملازمان سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے

''نوائے دل گداز'' سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ''جہاں گیری'' تو ایک طرف، جب یہ کرسی چھوڑ کر ریٹائر ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ ''یوسفِ بے کارواں'' کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔

انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اٹھتے ہیں تو دفتروں کا رخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اس کے پاس کبھی اس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ میر تقی نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ

ترے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا!

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابل رحم ان کی ایک اور حالت ہوتی ہے۔ ریٹائر ہوتے ہیں تو ''فتوحاتِ بالائی'' کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے، وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے، لیکن

پنشن اسی دن نہیں مل جاتی اسے منظور کرانے کے لئے دنوں مہینوں سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بت ہیں جنہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی انہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے اور انہیں بھی کسی کے حال زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرض مند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد وضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر یہ رسوم پرستی اور ہی گل کھلاتی ہے۔ الدین زندگی کے حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر وعمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے جسے الدین نے متعین کیا ہے۔ اور وہ مقصد ہے۔ ما ینفع الناس..... (13:17) ''جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو''۔ اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے' اور اس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب میں اس کی آزادی اور خود فیصلہ لینے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں انسان کے ایک ایک قدم کے لئے متعین ''شرعی احکام'' منضبط ملیں گے۔ بیٹھو اس طرح۔ اٹھو اس طرح۔ چلو اس طرح۔ سوؤ اس طرح۔ کھاؤ اس طرح۔ پیو اس طرح۔ غسل اس طرح کرو۔ بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔ حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعد وضوابط ہوں گے۔ ان قواعد وضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد' ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ ان احکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ عبوساً قمطریراً..... قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔

دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔ وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رو سے تمہارا نان ونفقہ تو میرے ذمے ہے' علاج معالجہ نہیں۔ اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔ اس قسم کی بن جاتی ہے ''فطرت'' ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔ پھر چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق وفاجر' جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔ اس سے وہ عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے' نہ انسانیت کی لچک۔ بیوروکریٹک کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔ جس طرح ان کے ہاں (D.F.A) اور (P.U.C) کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں ہوتا' ان کے ہاں بھی ساری زندگی ''مکروہ اور مباح'' کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے۔ اور ان کے فتوؤں میں انسانی زندگی کہیں بار نہیں پاتی۔ یہ انسان نہیں' قرآن کے الفاظ میں ''خشب مسندہ'' بن کر رہ جاتے ہیں۔